Regd. L. No.7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1976

طلوع اسلام کی مجوزہ کنونشن

۲۱ لغایت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء

(حتمی پروگرام بعد میں شائع ہوگا)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ 1½ ڈیڑھ روپیہ	ٹیلیفون ۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور	بدل اشتراک سالانہ پاکستان ـــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ـــــ ۲ پونڈ
نمبر ۱۰	اکتوبر ۱۹۷۶ء	جلد ۲۹

فہرست

۱- لمعات ـــــ ۲

۲- مراسلات ـــــ ۱۳

۳- عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار ـــــ (پرویز صاحب کا خطاب) ـــــ ۱۷

۴- جشنِ نزولِ قرآن ـــــ (سعد حسن بشیر) ـــــ ۴۱

۵- طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء ـــــ ۴۸

۶- حقائق و عبر ـــــ (۱) اقوامِ عالم کا رخ قرآن کی طرف - (۲) خداداد دولت کا مظاہرہ
(۳) اب اپنے گھر کی طرف آئیے - (۴) تو حلال ہے یا حرام - (۵) مودودی کی زندگی
کا پس منظر - (۶) دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال (۷) تحریفِ قرآنی کی ناپاک جسارت ـــــ ۴۹

۷- بزمِ مذاکرہ ـــــ (منعقدہ کنونشن ۱۹۷۵ء آخری قسط) ـــــ ۵۷

۸- مرغ کی قربانی ـــــ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ـــــ ۶۲

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ - علمی پرنٹنگ پریس - ہسپتال روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

امسال طلوعِ اسلام کنونشن اپنے روایتی ذوق و شوق اور باہمہ زیبائی و رعنائی، ۲۱ لغایت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء، ادارہ کے سامنے کے سبزہ زار میں منعقد ہو رہی ہے۔

طلوعِ اسلام ایک ماہنامہ ہی کا نام نہیں۔ یہ ایک عظیم فکری تحریک ہے جس کا مقصد قرآنِ کریم کے پیغام کو بایں نمط عام کرنا ہے کہ یہ صداقت ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے کہ انسانی زندگی کے مسائل کا حل اس دستاویزِ خداوندی کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا اور نوعِ انسان کی مشکلات اُسی نظام کی رُو سے دُور ہو سکتی ہیں جو اس صحیفۂ مقدسہ کے خطوط پر متشکل ہوگا۔ شکرِ ایزدی کہ اس تحریک کا دائرہ اب ملک کے دور دراز گوشوں تک ہی نہیں، بلکہ بیرونِ ملک بھی پھیل چکا ہے، اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کی تاریخی داستان بڑی دلکشا اور بصیرت افروز ہے۔ اس تحریک کے بانی اور نگران پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ وہ ۱۹۳۰ء کے پاکستانی ہیں۔ جب علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر اپنے خطبۂ صدارت میں (ہندوستان میں شاید پہلی بار) اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ اسلام کے ایک زندہ حقیقت بننے کے لئے لابدّ ہے کہ اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس کے بغیر اسلام، باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب کی شکل میں تو زندہ رہ سکتا ہے، الدّین نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اس مقصد کے لئے ہماری خواہش یہ ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں ہم قرآنی خطوط پر ایک آزاد مملکت قائم کر سکیں، اور اس طرح، اسلام کے دوبارہ الدّین بننے کے سلسلۂ زریں کا آغاز کر سکیں۔ اس وقت تو اسے کسی نے ایک شاعر کے خواب اور ایک فلسفی کے اندیشۂ فلاکی سے زیادہ کچھ اہمیت نہ دی لیکن جب ۱۹۳۷ء میں یہ خواب ایک حقیقت بننے لگا تو اپنوں بیگانوں سب کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ بیگانوں میں انگریز اور ہندو دونوں شامل تھے، اور

اپنوں میں پیش پیش وہ گروہ جو نیشنلسٹ علماء کے نام سے متعارف تھا، اور ازاں بعد وہ طوطی نقار خانہ جو اپنے آپ کو جماعتِ اسلامی کہہ کر پکارتی تھی۔ ہندو اور انگریز تو اس کی مخالفت خالص سیاسی وجوہات کی بنا پر کرتے تھے لیکن یہ "مسلمان مخالفین" مذہب کے نقاب میں اس کے درپئے تخریب تھے — یہ "قال اللہ اور قال الرسول" کے نعروں سے اس مطالبہ کو، جو خالصتہً دین کا تقاضا تھا، لادینی مطالبہ قرار دیتے تھے۔ اس محاذ کا مقابلہ کرنے کے لئے خود قائداعظمؒ کے ایما پر مجلہ، طلوع اسلام کا اجراء ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا۔ اس کے مدِمقابل ایسے ایسے بلند پایہ عمامہ پوش علماء تھے جن کے علم و فضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جن کی شہرت بین الاقوامی حیثیت کی حامل تھی — (مولانا) ابوالکلام آزاد۔ (مولانا) حسین احمد مدنی۔ (مفتی) کفایت اللہ۔ (مولانا) احمد سعید۔ (مولانا) حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ غرضیکہ (باستثناء چند) جملہ علماء دیوبند و دیگر دارالعلوم۔ سب ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے اور کانگرس کے فنڈ ان کی تحویل میں۔ ان سب کی مدافعت اور مقابلہ کے لئے، تنہا طلوع اسلام، اور بے ساز و سامان — لیکن اس نہتے پیغام برِ حق و صداقت نے، جس جرأت و بے باکی سے نہ صرف ان کا مقابلہ کیا بلکہ انہیں چاروں شانے چت گرا دیا۔ اس پر اُس زمانے کے اس کے قائل شاہد ہیں۔ طریقِ کار یہ تھا کہ ان مخالفین کی طرف سے جو نیا اعتراض اٹھایا (یا یوں کہئے کہ جو نیا تیر چلایا) جاتا۔ طلوع اسلام کے آئندہ شمارہ میں، اس کی تردید میں ایک نہایت مدلل اور بسوط مقالہ شائع کیا جاتا۔ ماہنامہ کی اشاعت تو محدود تھی، لیکن اس مقالہ کا الگ پمفلٹ چھاپ لیا جاتا اور اسے سارے ملک میں پھیلا دیا جاتا۔ بعض اوقات یہ پمفلٹ اُردو کے علاوہ، دیگر زبانوں میں بھی شائع کئے جاتے۔ نتیجہ اس کی اس سعیٔ پیہم اور تگ و تازِ مسلسل کا یہ تھا کہ ان مخالفین کے ترکش کے تمام تیر ایک ایک کرکے بیکار اور ختم ہو گئے، اور ملتِ اسلامیہ ان کے دامِ فریب سے نکل کر، جق در جق، تحریکِ پاکستان سے وابستہ ہونے لگی — اور یوں آخرالامر، "شاعر کے اس حسین خواب" نے، مملکتِ پاکستان کی محسوس تعبیر کا پیکر اختیار کر لیا۔ فالحمد للہِ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

اور اس کے بعد، یکم جنوری ۱۹۴۸ء سے طلوع اسلام کا نیا دَور، پاکستان میں شروع ہوا، جو بتوفیق ایزدی، بلا انقطاع اب تک جاری ہے — اور پھر اُسی بے ساز و سامانی کے ساتھ — یہاں پہنچنے کے بعد اس کے سامنے اور مسئلہ تھا۔ اور وہ یہ کہ جس مملکت کی تشکیل کے لئے یہ خطہ، زمین حاصل کیا گیا ہے، اس کے خط و خال کیا ہوں گے اور اس کی خصوصیات و امتیازات کیا — اور یہاں اس کی مخالفت، اس کے دورِ اوّل سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوئی، اور اُسی مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جو اس زمانے میں اس کے مدِمقابل تھا۔ اکثر لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ جب طلوع اسلام کا مقصد اور منتہیٰ، ایک ایسے نظامِ مملکت کا قیام ہے جس کی بنیادیں قرآن مجید پر ہوں تو مذہب پرست طبقہ اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے؟ یہ بات آسانی

سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس مخالفت میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہب پرست (حقیقی یا نام نہاد) طبقہ میں منظم گروہ صرف جماعتِ اسلامی کا ہے۔ اس جماعت کے پیشِ نظر پاکستان میں تھیاکریسی کا قیام ہے۔ تھیاکریسی سے مراد ہوتا ہے ایسا نظام جس میں اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہو۔ یہ جماعت، ملک کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس کے بانی مودودی صاحب، بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ ملک کی زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ ہم یہاں ایک دن میں قوانینِ شریعت نافذ کر کے دکھا دیں گے۔ یہ ہیں ان کے عزائم۔ اس کے برعکس جس قرآنی نظام کا طلوعِ اسلام داعی ہے اس میں، تھیاکریسی تو ایک طرف، مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ خلافتِ راشدہ میں، مذہبی پیشواؤں کا الگ وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں سب سے پہلی زد، جماعتِ اسلامی پر پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے طلوعِ اسلام کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔ یہ حضرات نہ تو کھلے بندوں اس امر کا اعتراف کرنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ ہماری وجۂ مخالفت کیا ہے، نہ ہی یہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ دلائل کی تردید کر سکتے ہیں۔ انہوں نے طلوعِ اسلام کی آواز کو غیر مؤثر بنانے کے لئے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اس کے خلاف ایسا پروپیگنڈا کیا جائے کہ کوئی شخص اس کے لٹریچر کے قریب نہ جائے ـــــ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔ اُردو میں نماز پڑھانا چاہتا ہے۔ ایک الگ فرقہ بنا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ ان میں سے ایک الزام بھی سچا نہیں۔ سب تہمت تراشیاں اور بہتان بافیاں ہیں۔ سارا پروپیگنڈہ جھوٹ پر مبنی ہے۔ چونکہ روپیہ ان کے ہاں بے شمار ہے اور اس کے بل بوتے پر ان کی پروپیگنڈہ مشینری کا جال سارے ملک، بلکہ بیرونِ ملک تک پھیلا ہوا ہے، اس لئے یہ اپنی اس سازش میں بہت کامیاب ہیں۔ آپ (کسی عامی یا مُلّا سے نہیں) کسی اچھے پڑھے لکھے آدمی کے سامنے طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کا نام لیجئے۔ وہ فوراً ناک بھوں چڑھا کر کہہ دے گا کہ اچھا! وہی پرویز جو منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ جو ملحد ہے، بے دین ہے۔ میں تو اس کے لٹریچر کو چھونے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اور جب آپ اس سے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اس کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ اس کا کوئی درس سنا ہے۔ اس سے کبھی ملے ہیں۔ تو جواب ملے گا کہ نہیں! ـــــ اس پر آپ پوچھیں گے کہ پھر آپ کو معلوم کیسے ہوا کہ وہ ملحد و بے دین ہے تو جواب ملے گا کہ ساری دنیا ایسا کہتی ہے! یہ ہے اس جماعت کے جھوٹے پراپیگنڈہ کا اثر، اس کی کامیابی کا راز اس میں بھی ہے کہ آپ کسی کے حق میں کچھ کہیئے تو مخالف شاید پانچ منٹ تک بھی آپ کی بات سننا گوارا نہ کرے۔ لیکن آپ اس کے خلاف کچھ کہیئے تو وہ گھنٹوں مزے لے لے کر محوِ گفتگو رہیں گے۔ اور اس کے بعد کبھی اتنی تکلیف گوارا نہیں کریں گے کہ جس کے خلاف اتنا کچھ کہا اور سنا گیا ہے، اس سے پوچھ لیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ زحمت اتنی بھی گوارا نہیں کریں گے، اور جو کچھ ان سے کہا گیا ہے، اسے بے چون و چرا اس طرح

دھراتے اور پھیلاتے چلے جائیں گے گویا وہ ان کا ذاتی تجربہ، مطالعہ ہے یا مشاہدہ ہے۔ یہ ہے ہماری قوم کی وہ کمزوری جس سے جماعتِ اسلامی فائدہ اٹھاتی ہے اور اپنے ہر مخالف کے خلاف ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ (WET-PAINT) بن جائے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جسے انہوں نے طلوعِ اسلام کی قرآنی آواز کو غیر مؤثر بنانے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ چونکہ انہوں نے دیگر مذہبی پیشواؤں کے دل میں یہ خیال جاگزیں کر رکھا ہے کہ اگر یہاں کا اقتدار، اربابِ مذہب کے ہاتھ میں آ گیا تو اس میں، ان کا بھی حصہ ہوگا، اس لئے وہ بھی پراپیگنڈہ میں ان کے ہمنوا اور آلۂ ابلاغ بن جاتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ جماعت اس طرح راستہ روک کر کھڑی نہ ہو جاتی، تو مملکتِ پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام کے امکانات بہت روشن ہوتے۔

اس طویل گفتگو سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ نے طلوعِ اسلام کا شائع کردہ لٹریچر نہیں دیکھا۔ پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم میں شرکت کا بھی موقعہ نہیں ملا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ان سے مل کر، براہِ راست ان کے خیالات سے آگہی حاصل کی ہے۔ تو یہ موقعہ ہے۔ آپ حالیہ کنونشن میں تشریف لائیے اور خود اپنے کانوں سے سنیئے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ پرویز صاحب کا پیغام کیا ہے، اور اس تحریک کے مقاصد کیا! آپ براہِ راست یہ معلومات حاصل کیجئے اور اس کے بعد اس کے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچئے کہ یہ تحریک، الحاد اور بے دینی پھیلاتی ہے یا قرآنی نظام کی تشکیل کی طرف دعوت دیتی ہے۔ اس کنونشن میں بعض اجلاس تو اس کے مندوبین تک محدود ہوتے ہیں جن میں یہ اپنے تنظیمی پروگرام کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بیشتر اجلاس کھلے ہوتے ہیں جن میں تمام اربابِ ذوق، سامعین کی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں۔ کنونشن کا متعین پروگرام تو وسط اکتوبر تک شائع ہوگا، لیکن چند صفحات آگے اس کا مشروط پروگرام آپ کے سامنے آ جائے گا۔ اس سے آپ کو اس کے کھلے اجلاسوں کی، تواریخ اور اوقات کا علم ہو جائے گا۔ طلوعِ اسلام کنونشن کے اجلاس نہایت سنجیدہ، متین اور پُروقار ہوتے ہیں جن میں کسی قسم کی غوغہ آرائی یا ہنگامہ خیزی کا دخل نہیں ہوتا۔ ان میں شرکت بھی اس شرط سے مشروط ہوتی ہے کہ سامعین خاموشی اور متانت سے اس کارروائی کو دیکھیں اور پیش کردہ خیالات کو سنیں۔ اور ان پر غور کریں۔ واضح رہے کہ ہمارا نہ کوئی الگ مذہبی فرقہ ہے، نہ کسی خاص فرقہ سے تعلق ——— نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے کوئی واسطہ۔ ہم مذہبی مناقشوں اور عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتے۔ ہم نہایت خاموشی سے قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کرتے ہیں، اس سے زیادہ ہمارا کوئی پروگرام نہیں۔ اگر آپ کو اس سے دلچسپی ہے تو اس کنونشن میں ضرور تشریف لائیے۔

(۲)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

محترم وزیرِاعظم (پاکستان) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ۸ ستمبر ۱۹۷۶ء کو، ایک ترمیمی بل پر بحث کرتے ہوئے، سینٹ میں ایک تقریر فرمائی جس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کے ضروری حصوں کو طلوعِ اسلام کے صفحات میں منضبط کر لیا جائے۔ انہوں نے فرمایا:-

> حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو حاصل ہے لیکن اس دنیاوی ماحول میں یہ حاکمیت انسانوں کو بھی تفویض کی گئی ہے اور اس کی حاکمیت اور خودمختاری کو، پارلیمنٹ میں، لوگوں کی طرف سے ان کے منتخب نمائندے استعمال کرتے ہیں .... ہم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر پورا ایمان رکھتے ہیں اور ذاتِ باری تعالیٰ کی نہ صرف پاکستان میں بلکہ ساری کائنات میں حاکمیت ہے۔ اس عقیدہ کا اظہار اس لئے آئین میں کیا گیا ہے ...... حاکمیت کا عوام کو بالواسطہ حق پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حاکمیت کا حق خود ہی انسان کو تفویض فرما دیا۔ ورنہ انسان نہ کوئی ذمہ داری پوری کر سکتا اور نہ کوئی فرض ہی ادا کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی انسان کو سونپی ہوئی حاکمیت کے بغیر نہ حکومتیں ہی چل سکتیں اور نہ لوگ ـــــ عدلیہ، قانون سازی اور دیگر عام قوانین سے متعلق ضروری مسائل سے نمٹ سکتے۔ خدائے ذوالجلال نے اپنی حاکمیت نوعِ انسان کے منتخبہ نمائندوں کو سونپ دی ہے اور انسان کے اس اعتراف کے بعد، حقیقی احکم الحاکمین اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حاکمیت عوام کو تفویض کی گئی اور عوام نے وہ مقننہ کو سونپ دی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے انسانوں تک پہنچی اور پھر عوام کے نمائندوں کو ملی۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکمیت مقننہ کی ہے۔
>
> (نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء)

محترم وزیرِاعظم نے اس تقریر میں جو بنیادی نکتہ پیش کیا ہے، ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ، وہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جس کا ازالہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ وہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور خدا تعالیٰ کے حقیقی تصوّر کے خلاف ہے اور اس کے نتائج بہت دُور رس ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے، اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض (DELEGATE) نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی نہیں ـــــ رسولؐ بھی اس کے عبد ہوتے تھے۔ یعنی احکامِ خداوندی کے مطیع اور محکوم۔ جو اتھارٹی اپنے کسی اختیار کو، کسی دوسرے کو تفویض کر دیتی ہے، وہ اس وقت تک، جب تک وہ اس تفویض کردہ اختیار کو واپس نہ لے لے، اس اختیار سے عاری رہتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ عقیدہ

کہ وہ اپنے اختیارات کو انسانوں (عوام) کو سونپ کر، خود ان اختیارات سے (وقتی طور پر ہی سہی) عاری اور محروم ہو چکا ہے، باطل ہے۔ قرآنِ کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ اس نے تمام انسانوں کو خدا کے احکام کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

تفویض (DELEGATION) کا عقیدہ درحقیقت کلیسا (CHURCH) کا وضع کردہ ہے جس کی رو سے اس نے اپنے آپ کو خدائی اختیارات کا حامل قرار دے دیا۔ اس سے تھیاکریسی کی بنیاد پڑی اور اربابِ کلیسا نے، خدا کے نام پر، انسانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے ـــ تھیاکریسی، کسی مذہب کی بھی کیوں نہ ہو، اس کا نتیجہ بے پناہ مظالم ہوتے ہیں۔ چرچ کے بعد جب اقتدار، عیسائی بادشاہوں نے سنبھالا، تو انہوں نے، تھیاکریسی میں ذرا سی تبدیلی کر کے، بادشاہوں کے حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS OF THE KING) کا عقیدہ وضع کر لیا۔ یہ جو (گویا) مسلّمہ کی حیثیت سے کہا جاتا ہے کہ "بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا" وہ اسی عقیدہ پر متفرع ہے۔ ملوکیت مسلمانوں کے ہاں آئی تو اسی باطل تصور نے "السلطان ظل اللہ علی الارض" (بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے) کا روپ دھار لیا ـــ اب اُمت بے چاری دُہرے عذاب میں مبتلا ہو گئی ـــ دنیاوی امور میں بادشاہ، خدائی اختیارات کا حامل، اور مذہبی امور میں مذہبی پیشوا۔ اس کی سند میں یہ کہا گیا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور انسانوں سے مراد ہیں اس کے منتخب بندے ـــ سلاطین اور علماء ـــ حالانکہ خدا نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ ہیں وہ نتائج جو "تفویض" کے تصور کا منطقی نتیجہ ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ سوال سارا انسان کا اپنے ان اختیارات کے استعمال کا ہے ـــ خدا سے انکار کرنے والے، ان اختیارات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اسے سیکولرازم کہا جاتا ہے جس کی عملی شکل مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے۔ اس نظام میں، عوام کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ (مقننہ) جس قسم کے جی چاہے آئین اور قوانین بنا سکتی ہے۔ اس پر اس ضمن میں کسی قسم کا کنٹرول یا پابندی نہیں ہوتی۔ وہ اختیاراتِ مطلق کی حامل (SOVEREIGN) ہوتی ہے۔

لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے، اپنے اختیارات کو بلا حدود و قیود استعمال نہیں کر سکتے۔ انہیں ان اختیارات کو، خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، استعمال کرنا ہوتا ہے۔ (یہ حدود خدا کی کتاب میں درج ہیں اور ابدی اور غیر متبدل ہیں) اسے اسلامی نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں، مقننہ کے قانون سازی کے اختیارات، مطلق (ABSOLUTE) یا غیر محدود نہیں ہوتے۔ ان پر حدود اللہ کا کنٹرول ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی خصوصیت جس کی رو سے، اسلامی جمہوریت، مغربی جمہوریت یا سیکولرازم سے متمیز اور مختلف ہوتی ہے۔ یوں انسانی دنیا میں،

خدا کی حاکمیت، یا SOVEREIGNTY) قائم و دائم رہتی ہے۔ خارجی کائنات میں اس کی حاکمیت از خود قائم رہتی ہے۔ کیونکہ اشیائے کائنات کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا نہیں کیا گیا۔ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت (یا یوں کہیئے کہ حدود اللہ کے اندر زندگی بسر کرنے) پر مجبور ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی دنیا میں، انسان، اُس کی (خدا کی) حاکمیت کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ (یعنی خود اپنے فیصلے سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے) یہی کفر و اسلام میں امتیازی نقطہ ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔" آئینِ پاکستان (۱۹۷۳ء) میں یہی پوزیشن اختیار کی گئی ہے۔ اس کے پیش لفظ کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

> جملہ کائنات پر اقتدارِ مطلق خدا کا ہے۔ اور باشندگانِ پاکستان جو اختیارات اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے، وہ ایک مقدس امانت ہوگی۔

آپ دیکھئے۔ اس میں "خدا کے تفویض کردہ اختیارات" نہیں کہا گیا۔ وہ اختیارات کہا گیا ہے، جنہیں باشندگانِ پاکستان خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے۔ (شروع میں جب قراردادِ مقاصد کا مسودہ زیرِ بحث تھا تو اس میں تفویض کا تصور رکھا گیا تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف تفصیلی بحث کی، اور اس کی جگہ حدود اللہ کی پابندی، جزوِ آئین قرار دی گئی)۔ محترم وزیرِ اعظم نے اپنی اس تقریر میں کہا ہے۔

آئین مقننہ کو خود مختاری عطا کرتا ہے۔ تمام قوانین کی منظوری دیتا ہے۔

معاف فرمائیے۔ آئین، مقننہ کو حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری عطا کرتا ہے، اور صرف ان قوانین کی منظوری دیتا ہے جو ان حدود کے مطابق ہوں۔ ان سے متصادم نہ ہوں، ہماری اصل دشواری یہ ہے کہ آئین میں یہ الفاظ تو رکھ دیئے گئے ہیں، لیکن اس میں کوئی ایسی اتھارٹی متعین نہیں کی گئی۔ جو اس بات کا فیصلہ دے کہ مقننہ کے زیرِ غور مسودۂ قانون (یا کوئی آرڈیننس) حدود اللہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کی شق درج ہے۔ لیکن اس کونسل کی حیثیت محض مشاورتی ہے اور وہ بھی صرف ان امور میں جن کے متعلق اس سے مشورہ طلب کیا جائے۔ اس کی حیثیت فیصلہ کن اتھارٹی کی نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی اتھارٹی مقرر کر دی جائے تو اختیارِ مطلق (SOVEREIGNTY) اس اتھارٹی کو حاصل ہو جائے گا۔ مقننہ کو نہیں۔ لیکن یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس صورت میں بھی اختیارِ مطلق نہ اس اتھارٹی کو حاصل ہوگا، نہ مقننہ کو۔ اختیارِ مطلق کتاب اللہ کو حاصل رہے گا۔ اور یہی اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت ہے — آئین میں اگر "حدود اللہ کی پابندی" لاینفک قرار دی گئی ہے تو اس پر عمل پیرا ہونے کی بھی تو کوئی شکل

ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر آئینی شرط کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

(۳)

نظامِ نو کی طرف دعوت

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ انسانوں نے اوّل و آخر، اس کے متعین کردہ نظام کی طرف آنا ہے۔ اگر یہ طوعاً اس طرف آ جائیں گے تو بہت سی جانگسل مصیبتوں اور استخواں شکن مشقتوں سے بچ جائیں گے۔ اگر اب نہیں کریں گے تو زمانے کے تقاضے انہیں کرنؔ اس طرف لائیں گے۔ اس کا طریق یہ ہوگا کہ انسان تنہا اپنی فکر کی رو سے ایک نظام تجویز کرے گا۔ ایک عرصہ تک اس پر عمل پیرا رہے گا۔ اس کی پیدا کردہ خرابیوں کو جھیلتا جائے گا۔ اور آخر الامر وہ نظام ناکام ثابت ہوگا تو اس کی جگہ کوئی اور نظام وضع کر لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ہر ناکامی کے بعد، اس کا قدم لاشعوری طور پر اس منزل کی طرف اٹھے گا جسے قرآن نے متعین کر رکھا ہے۔ قرآن کی متعین کردہ منزل کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں تمام نوعِ انسان کی منفعت کے لئے، ایک ہی ضابطۂ حیات ہوگا جو ساری دنیا پر نافذ ہوگا۔ اس طرح وحدتِ انسانیہ کا فردوس بداماں نظام متشکل ہو جائے گا۔

انسان نے اپنی معیشت کے لئے نظامِ سرمایہ داری وضع کیا لیکن قریب قریب قرن کی آزمائشوں کے بعد، وہ ناکام ثابت ہوا، اس کی جگہ اس نے کمیونزم کا نظام وضع کیا اور سمجھا یہ گیا کہ اس سے انسان کی معیشت کا لاینحل مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن یہ ابھی گھٹنوں بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ چنانچہ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ جن ممالک میں، سرمایہ داری کا نظام کہن (اپنی قدیمی یا ترمیم یافتہ) شکل میں رائج ہے، وہ بھی چلا رہے ہیں، اور جن ممالک نے اپنے ہاں سوشلزم کا نظام رائج کر رکھا ہے، وہ بھی رو رہے ہیں۔ اب ایک تیسری آواز ابھری ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ سوال نہ سرمایہ دار ممالک کا ہے، نہ کمیونسٹ ممالک کا۔ ساری دنیا کی اقوام یا ممالک دو حصوں میں بٹ چکے ہیں — ایک ترقی یافتہ (DEVELOPED) اور دوسرا ترقی پذیر (UN-DEVELOPED) ترقی یافتہ ممالک — خواہ وہ کمیونسٹ ہوں اور خواہ سرمایہ دار۔ ترقی پذیر ممالک کا خون نچوڑتے جا رہے ہیں۔ ان (آخر الذکر) ممالک کو ان کے پنجۂ خونیں سے نجات دلانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ممالک، اپنا الگ محاذ قائم کریں۔ اس محاذ کو تیسری دنیا، کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم پاکستان (مسٹر بھٹو) نے اگلے دنوں اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک طویل مقالہ شائع کیا ہے، جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد تجویز کیا ہے کہ اس تیسری دنیا کی ایک کانفرنس منعقد ہونی چاہیئے۔ اس مقالہ کے آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ:-

تیسری دنیا کے پھیلے ہوئے انسان، اپنے اجتماعی ارادہ کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے

کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے قلعہ کی تلاش میں ہیں جہاں سے وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر، انسانیت کشی کے خلاف، انسان کی آخری فتح کے لئے جہاد کر سکیں۔ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ غریبوں کے لئے یہ سب سے پہلا کرنے کا کام ہے۔ جو کانفرنس میرے پیش نظر ہے اس میں شرکت کے لئے ایک ہی بے لچک آہنی معیار ہوگا ——— یعنی تیسری دنیا کے غیر ترقی یافتہ، پامال انسانوں کا اجتماع ——— یہ ممالک خواہ (سیاسی طور پر) کسی بیرونی طاقت کے وابستہ دامن ہوں یا آزاد ہوں۔ ان کا تعلق کمیونسٹ ممالک سے ہو یا غیر کمیونسٹ ممالک سے۔ یہ سفید فام ہوں یا زرد۔ سیاہ فام ہوں یا بھورے رنگ کے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی تمام ترقی پذیر اقوام اس مشن میں شریک ہوں گی، اور اس طرح اس نظام کی تشکیل کے لئے طلائع پیش رس (یا ہراول دستہ) کی حیثیت اختیار کریں گی جو ایک نئی دنیا کے وجود میں لانے کا موجب بنے گا جس میں تمام انسان ایک ہی ضابطۂ قانون کے تحت زندگی بسر کریں۔

(پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۷۶ء)

کس قدر حسین ہے یہ تخیل اور کیسی دلکش ہے یہ صدا! ——— یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو۔ لیکن، محترم وزیراعظم کے خلوصِ نیت پر شبہ کئے بغیر ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس سے کوئی اقتصادی تبدیلی رونما ہو جائے تو ہو جائے، اس قسم کا عالمگیر انقلاب ظہور میں آتا دکھائی نہیں دیتا ——— انقلاب میکانکی تدابیر سے واقع نہیں ہوتا۔ اس کا چشمہ دلوں کی گہرائی سے پھوٹا کرتا ہے، جب تک دلوں میں انقلاب پیدا نہ ہو، خارجی احوال میں انقلاب پیدا ہو نہیں سکتا۔ آج سے قریب ساٹھ سال اُدھر، روس سے بھی ایک دلکش صدا فضائے عالم میں گونجی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ ——— دنیا کے محنت کشو متحد ہو جاؤ۔ اس جنگ میں سوائے اس کے کہ تمہاری زنجیریں کٹ جائیں، تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا ——— ایک دیدہ ور نے بھی اس صدائے دلکش کو سنا، اور اس آواز دینے والے سے کہا کہ:-

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟

تو ایک نظامِ نو کی آرزو لے کر تو اٹھا ہے لیکن تو نے اس محکم بنیاد کو بھی تلاش کر لیا ہے جس پر اس قدر عظیم انقلاب کی عمارت استوار ہوگی؟ اس نے اس نہایت مشفقانہ مشورہ کو ان سنی کر دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ چند ہی سال کے بعد، محنت کشوں کا یہ ہمدرد اور مزدوروں کا غمگسار خود سب سے بڑی استحصالی قوت بن کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ اب اسی استحصالی قوت کے پامال کردہ غریبوں کو اس نظامِ نو کی آواز پر جمع ہونے کے لئے پکارا گیا ہے ——— سو اصل سوال

اساسِ محکم کا ہے۔ اور وہ (اقبالؔ ہی کے الفاظ میں) اُم الکتاب (قرآن مجید) کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی ـــــ انسان کی مظلومیت کا حل اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ قرآنی اقدار کی روشنی میں ان کے اندر نفسیاتی تغیر پیدا کیا جائے۔ وہ تغیر اساسِ محکم بن سکے گا، خارجی انقلاب کا ـــــ قرآن، وحدتِ انسانیت کا یہی طریق تجویز کر رہا ہے۔

بایں ہمہ اگر زیرِ نظر اسکیم سے، دنیا کے پامال اور پس ماندہ انسانوں کی خوشحالی کا سامان ہو سکے، تو یہ بھی از بس غنیمت ہے۔ مسٹر بھٹو کی اس اسکیم کا چرچا بیرونی ممالک میں بھی ہو رہا ہے جس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے سیاستِ خارجہ میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے اور بڑی بڑی قومیں بھی ان کے لئے گوشِ بر آواز رہتی ہیں۔

(۴)

ماؤزے تنگ کی وفات

گذشتہ ماہ (ستمبر ۱۹۷۶ء) چین کے محبوب ترین رہنما اور معلّم ماؤزے تنگ کی وفات، چین کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ طبیعی عمر کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ماؤزے تنگ کی وفات قبل از وقت نہیں تھی، لیکن جہاں تک اس قوم کا تعلق ہے، ان کے اس عزیز ترین راہنما کی وفات جب بھی ہوتی، قبل از وقت قرار پاتی۔ اس نے اپنی قوم کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا دیکھ لینا کافی ہوگا کہ اس سے پہلے اس ملک اور اس قوم کی حالت کیا تھی، اور اس کے بعد اس میں کیا تبدیلی ہی نہیں، انقلاب آیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عظیم انقلاب میں، اس راہ نما کے رفقا، بلکہ وہاں کے عوام، سب شریک تھے لیکن یہ درحقیقت نتیجہ تھا اس لیڈر کی قابلِ صد رشک قیادت کا۔ یہ بھی درست ہے کہ ماؤزے تنگ بہت بڑا سیاسی مدبر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گوریلا اندازِ حرب کا موجد اور قابل ترین ماہر تھا۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن اس قسم کا انقلاب محض سیاسی تدبر کی فسوں سازی یا عسکری صلاحیت کی نبرد آزمائی سے برپا نہیں ہو سکتا۔ اس میں انقلاب آفریں شخصیت کے حسنِ کردار کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے۔ ماؤ کے کردار کے مختلف گوشے تھے لیکن ہمارے نزدیک ان میں اوّلیں حیثیت اس کی بے پناہ اصول پرستی کو حاصل تھی جسے غالبؔ نے "وفاداری بشرطِ استواری" اور اقبالؔ نے "بخود خزیدگی" سے تعبیر کیا ہے۔ ذرا سامنے لایئے اس حقیقت کو کہ کمیونزم کے علمبردار دو ہی ملک تھے۔ روس اور چین۔ باقی ساری دنیا ان کی مخالف تھی۔ اس میں روس کو سبقت حاصل تھی اور چین کی حیثیت اس کے پس رو کی سی تھی۔ آزادی کے لحاظ سے چین ایک نوزائیدہ مملکت تھی اس لئے اُسے روس کے سہارے کی بڑی ضرورت تھی، لیکن جب روس کمیونزم کے اصولوں سے ذرا ہٹا، تو ماؤزے تنگ نے تمام عواقب سے بے نیاز ہو کر، نہایت جرأت اور بیباکی سے اس کی مخالفت کی، اسے تجدد پسند اور "بدعتی" قرار دیا۔ اور جب روس نے اپنی روش نہ بدلی، تو ماؤزے تنگ نے بُرملا اس سے علیحدگی اختیار کر لی، اور آخر دم تک اس کا

مخالف رہا، حالانکہ "حکمت عملی" کا تقاضا تھا کہ وہ روس سے بنائے رکھتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عصرِ رواں میں، جبکہ میکیاولی سیاست کا سکہ ہر جگہ رواں ہے، اس قسم کی بے لچک اصول پرستی یا تو قائداعظمؒ کے ہاں ملے گی یا ماؤزے تنگ کی شخصیت میں۔

اس کے کردار کا دوسرا تابندہ گوشہ یہ تھا کہ اسٹالن اور روس کے دیگر اساتین نے کہا کہ کمیونزم کا نظام، قوت، نفرت اور تشدد کے بل بوتے پر قائم کیا جا سکتا ہے اور انہوں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا، لیکن ماؤ نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ اسے محبت کے ذریعے استوار کیا جا سکتا ہے۔ اگر قوم کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر دیا جائے تو اس کی انسانی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ سرکس کے جانوروں کی طرح وہی کرتب دکھا سکتی ہے جن کے لئے اسے ڈنڈے کے زور پر سدھا دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے دل میں اپنے قائدین کا احترام پیدا ہو جائے اور وہ ان سے محبت کرنے لگے، تو وہ ہر قربانی کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ ہی نہیں، بیتاب ہو جاتی ہے۔ ماؤ نے یہ کچھ کہا ہی نہیں، بلکہ اپنے حسنِ کردار سے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس کی قوم نے خدا سے تو انکار کیا لیکن ماؤ کو اس کی جگہ بٹھا دیا۔

اور ماؤ نے تیسرا بنیادی نکتہ یہ پیش کیا کہ قوموں کی تعمیر فکری انقلاب سے ہوتی ہے۔ ہنگاموں سے نہیں۔ چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ان کا جو مقالہ شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:۔

> دانشوری کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ماؤزے تنگ کے کردار کے یہ گوشے ہر اس راہنما کے لئے مثالی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنی قوم کی تعمیر صحیح خطوط پر کرنا چاہتا ہو۔ یہ المیہ ہے کہ ماؤ کے سامنے بھی وہ "اساسِ محکم" نہیں تھی جس کی طرف اقبالؒ نے روس کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ساری دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر جاتے۔ دیکھئے اب ماؤ کے بعد، اس قوم کی روش کیا ہوتی ہے۔ اس نے اس کی وفات کے بعد، اپنی روش کا جو پہلا مظاہرہ کیا ہے وہ تو بہ حیثیت مجموعی بڑا امید افزا ہے۔ عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کا مدار منافقت پر ہے۔ اس میں عام روش یہ ہوتی ہے کہ قوموں کے دل میں ایک دوسرے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ لیکن وہ تو ہاہمی [illegible] پیشانی سے باہم گر خیرسگالی کے تحائف کا تبادلہ کرتی ہیں۔ لیکن اہلِ چین نے اس منافقت سے کام نہیں لیا۔ روس، اور اس کے دیگر حلیف کمیونسٹ ممالک نے ماؤ کی وفات پر چین کو پیغاماتِ تعزیت بھیجے تو اس نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہہ کر انہیں مسترد کر دیا کہ [illegible] ہمیں بھلا ان سے کیا واسطہ، جو اس کے نام نشان ہیں۔ اس دور میں دل اور زبان کی اس قسم کی رفاقت کا مظاہرہ، بڑا خوش آئند ہے۔ شاذ کر ہے کہ وہ قوم اس روش پر کاربند ہے کہ جو کچھ دل میں ہو وہی زبان پر لائے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

بابُ المراسلات

فرقے یا مکاتبِ فکر

طلوعِ اسلام کے ایک دیرینہ صاحبِ علم قاری کا ذیل کا مراسلہ قابلِ توجہ ہے۔

"جیسا کہ آپ کو علم ہے طلوعِ اسلام سے میرا قدیمی رابطہ ہے۔ اس نے ہمارے مروجہ غیر قرآنی عقائد و مسالک کی جس طرح نشاندہی کی ہے ان میں سے ہر کوشش مستحق ستائش ہے۔ لیکن میرے نقطۂ نگاہ سے اس نے فرقوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن شریف تو ہم سب کے سامنے تھا لیکن یہ امر موجبِ صد تاسف ہے کہ ہماری اس طرف کبھی نگاہ ہی نہ گئی کہ اس نے فرقہ بندی کو بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے اور رسولؐ اللہ سے کہا ہے کہ اسلام میں فرقہ پیدا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ان نصوصِ قرآنیہ کو اس طرح اجاگر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے مذہبی راہ نما (علماء کرام) خدا کے خوف سے لرز اٹھیں گے اور فرقہ بندی سے تائب ہو جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مذہب کی گرفت اس قدر سخت اور ذاتی مصلحتیں اس قدر جاذب ہوتی ہیں کہ وہ واضح دلائل سامنے آ جانے کے بعد بھی باطل پرستی کو چھوڑ کر حق کی طرف آنے ہی نہیں دیتیں۔ اس کے لئے واقعی بڑی جرأت ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بایں ہمہ آپ کے دلائل اس قدر مسکت تھے۔ (یا یوں کہئے کہ قرآنی نصوص اس قدر بیّن تھیں کہ ان سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا اس لئے یہ حضرات بالکل خاموش تھے۔ لیکن، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے جب یہ حضرات طلوعِ اسلام کے پیہم اصرار سے تنگ آ گئے تو ابلیس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم کہو کہ ہم فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ چونکہ یہ ابلیسی دلیل ان کے لئے بہت بڑا سہارا بن رہی تھی اس لئے یہ اس سے بہت خوش ہو گئے۔ چنانچہ اب ہر طرف سے اسے اچھالا جا رہا ہے۔ گویا یہ محض لفظوں کی تبدیلی سے (بقول طلوعِ اسلام، رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر) خدا کو (معاذ اللہ) فریب دے رہے ہیں کہ دیکھ لو! ہم آپ کی گرفت سے کس طرح بچ گئے۔ ہمارے فرقے بھی بدستور قائم رہے، اور ہم آپ کے غضب سے بھی محفوظ ہو گئے ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ خدا فریبی یا (بالفاظِ صحیح) خود فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید کہیں اور مل سکے۔ گویا ان کی الگ الگ نمازیں۔ جداگانہ مسجدیں (جنہیں سورۂ توبہ میں کفر اور دشمنانِ خدا کی پناہ گاہیں قرار دیا گیا ہے) سب "فکری اختلاف" ہیں، عملی تفریق نہیں! ان سے کوئی پوچھے کہ اگر یہ محض فکری اختلافات ہیں تو قرآن شریف نے جس چیز کو "تفریقاً بین المؤمنین" (سورۂ توبہ آیت ۱۰۷)

اور "فرّقوا دینھم" (سورۂ روم۔ آیت ۳۲) سے تعبیر کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس کی کوئی مثال دیجئے تاکہ مکتبِ فکر اور فرقہ بندی کا فرق سامنے آسکے۔

میں ان سے ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:-

بنی اسرائیل کی قوم بہتّر فرقوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ میری اُمت تہتّر فرقوں میں منقسم ہوگی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔ (مشکوٰۃ۔ جلد اوّل)

اس حدیث کو تمام فرقے صحیح تسلیم کرتے اور اپنے فرقہ کو جنتی (اور دوسرے فرقوں کو دوزخی) ثابت کرنے کے لئے بطور سند پیش کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی پیش کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے موجودہ فرقے مکاتبِ فکر ہیں۔ ان میں فرقہ کوئی نہیں۔ تو حضورؐ نے جن تہتّر فرقوں کا ذکر فرمایا ہے وہ کونسے ہیں؟ اور اگر فرقہ کوئی بھی نہیں تو پھر حضورؐ کے اس ارشاد کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مسلمانوں میں دین سے برگشتہ کرنے والے اس قدر عقائد اور اعمال کس طرح وجود میں آگئے۔ اس کا سبب کیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مذہبی پیشوا محض اپنی قیادت (لیڈر شپ) قائم رکھنے کے لئے ان باطل عقائد کی نگاہ فریب تاویلات سے عوام کو گمراہ کرتے رہتے۔ قرآن شریف نے اسی لئے ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ یہی ہیں وہ مذہبی لیڈر جن کے متعلق عوام، خدا سے عرض کریں گے کہ ربنا انا اطعنا سادتنا وکبرآءنا فاضلونا السبیلا۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۶۷) اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور اکابر کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے گمراہ کر دیا۔ اور یہی ہیں وہ مذہبی پیشوا جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ "قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۲۵)۔ مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا قرآن شریف کے ان ارشادات پر ایمان ہی نہیں۔ ورنہ یہ نہیں سکتا کہ دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے ارشادات پر ایمان، تو پھر اس قدر واضح نصوص کی موجودگی میں انسان، محض الفاظ کی تبدیلی سے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہ (فرقوں کو مکاتب فکر کہنے سے) الفاظ کی تبدیلی ہی تو ہے جس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: اسماء سمیتموھا انتم و آباءکم۔ (سورۂ یوسف۔ آیت ۴۰) کچھ نام ہیں جو پہلے تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے اور اب تم رکھ رہے ہو۔ ما انزل اللّٰہ بھا من سلطٰن (ایضاً) انہیں خدائی سند تو حاصل نہیں۔ خدا نے فرقہ بندی کہا (فرقوا)۔ انہوں نے ان کا نام مکاتبِ فکر رکھ لیا۔ جس طرح مشرکینِ عرب، اپنے بتوں کا نام لات اور منات اور ہبل اور عزیٰ رکھ کر کہتے تھے کہ ہم انہیں اللہ تو نہیں کہتے۔

ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ ان لوگوں کو اتنی جرأتِ ایمانی عطا کر دے کہ یہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکیں۔ بہرحال آپ جس جہاد میں مصروف ہیں اسے جاری رکھئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ والسلام"

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارہ طلوع اسلام ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ یہ رعایت ان کتابوں پر جن کی فہرست درج ذیل ہے امسال بھی دی جائیگی۔ شرط یہ ہے کہ جو کتابیں مطلوب ہوں، ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء تک موصول ہو جائے۔ اس کے بعد وہ کتابیں بذریعہ ڈاک بھیج دی جائیں گی اور خرچ ڈاک وی۔ پی کے ذریعے وصول کیا جائے گا۔ کنونشن کے موقع پر، پنڈال کے ساتھ بک سٹال قائم کر دیا جائے گا۔ یہ کتابیں انہی قیمتوں پر وہاں سے بھی دستی خریدی جا سکیں گی۔ فہرست کتب جن پر رعایت دی جائے گی، (جن کتابوں کی قیمت کے سامنے رعایتی قیمت درج نہیں، وہ پوری قیمت پر مل سکیں گی۔ چاہے بذریعہ ڈاک منگوائی جائیں یا بک سٹال سے دستی خریدی جائیں۔)

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
مفہوم القرآن پارہ اوّل	۵/-	
" " پارہ نمبر ۲ تا پارہ نمبر ۲۷ (فی پارہ)	۳/-	
" " پارہ نمبر ۲۸ و ۲۹	۷/- "	
" " پارہ نمبر ۳۰	۵/- "	
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	۱۲۰/-	۱۱۰/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کچے پارے)	۹۵/-	۸۰/-

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	۱۰۰/-	۸۰/-
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۴۰/-	۳۵/-
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن مجلد)	۱۵/-	۱۲/-
اسلام کیا ہے؟ (سستا ایڈیشن)	۸/-	
من و یزداں	۲۵/-	۲۰/-
ابلیس و آدم	۲۵/-	۲۰/-

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
جوئے نور	۲۵/-	۲۰/-
برقِ طور	۲۵/-	۲۰/-
شعلۂ مستور	۲۵/-	۲۰/-
جہانِ فردا	۲۵/-	۲۰/-
کتاب التقدیر	۳۰/-	۲۵/-
معراجِ انسانیت	۴۵/-	۴۰/-
شاہکارِ رسالت	۴۵/-	۴۰/-
اقبال اور قرآن	۲۵/-	۲۰/-
انسان نے کیا سوچا؟	۲۰/-	۱۵/-
ISLAM-A-CHALLENGE (BOUND)	۴۰/-	۲۵/-
ISLAM-A-CHALLENGE (P.B)	۲۵/-	۲۰/-
سلسبیل	۱۰/-	۷/-
فردوسِ گم گشتہ	۱۰/-	۷/-
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/-	۱۰/-
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ)	۳۶/-	۳۰/-
طاہرہ کے نام	۶/-	۵/-
مقامِ حدیث (جدید ایڈیشن)	۱۰/-	۸/-

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
اسلامی معاشرت	۴/-	۳/-
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ) (جلد دوم سوم جدید ایڈیشن)	۲۵/-	۲۰/-
جہاد	۲/۵۰	۲/-
عربی خود سیکھئے (جدید ایڈیشن)	۱۰/-	۸/-
پاکستان کا معمارِ اوّل	۳/۵۰	۲/-
قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان	۱۵/-	
فجر الاسلام (جلد اوّل)	۵/-	۳/-
فجر الاسلام (جلد دوم)	۵/-	۳/-
اسلام پہ کیا گذری	۸/-	
منزل بہ منزل	۸/-	۵/-
قتلِ مرتد	۲/-	۱/-
عالمگیر افسانے	۱/-	-/۵۰
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام	۳/-	۲/-
جمع القرآن	۳/-	۲/-
تاریخ الامّت (مکمل سیٹ) (آٹھ جلدیں)	۲۷/-	۲۰/-

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی یاد میں

عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار

(قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح)

پرویز صاحب کا خطاب جسے انہوں نے قائدِ اعظمؒ
کے یومِ وفات کی تقریب منعقدہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۶ء
پر (بطورِ خصوصی درس) پیش فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار

قائدِ اعظمؒ

(۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی یاد میں)

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دِن بہار کے

عزیزانِ گرامی قدر ـــــ سلام و رحمت۔

ہم آج اس بطلِ جلیل کی یاد منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کا دوام، جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔ میرے ذہن میں جب بھی قائدِ اعظم (علیہ الرحمتہ) کی یاد تازہ ہوتی ہے (اور شاید ہی کوئی ملی ایسا ہو جب کسی نہ کسی نوع سے یہ یاد تازہ نہ ہوتی ہو۔) علامہ اقبالؒ کے یہ زندۂ جاوید اشعار بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں، جو انہوں نے مسجدِ قرطبہ کے حوالے سے کہے ہیں کہ ؎

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا ‏ ‏ نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام ‏ ‏ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اس لئے کہ ؎

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ ‏ ‏ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

اور عشق سے مراد ہے اپنے مقصد کی سچائی اور پاکیزگی پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے عملِ پیہم۔ یہی وہ سرمستِ بادۂ عشق ہے جس کے متعلق علامہ نے کہا ہے کہ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ ‏ ‏ غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل ‏ ‏ اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو ! ! رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

یہی ہے عقل و عشق کا وہ حسین آمیزہ جسے ہم قائدِ اعظم محمد علی جناح کہہ کر پکارتے، اور مخلص قلوب اس پکار سے اپنے اندر گرمیٔ نبضِ حیات محسوس کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جس قوم کی فکر ناپختہ ہو، اس کے لئے صاف اور سادہ حقائق بھی معمہ بن کر رہ جاتے ہیں، اور کھلی ہوئی، روشن حقیقتیں بھی اس کے لئے بھارتیں بن جاتی ہیں۔ ہماری قوم کے لئے انہی بھارتوں میں یہ روشن حقیقتیں بھی شامل ہیں کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ اور اس کے حصول کے اسباب و ذرائع کیا تھے۔ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لال بجھکڑ (جنہیں عرفِ عام میں دانشور کہا جاتا ہے) ان بھارتوں کے بوجھنے میں برسوں سے پریشان و سرگرداں ہیں، اور اپنی تحقیق و تفتیش کے نتیجہ میں ایسی ایسی دُور کی کوڑی لاتے ہیں جسے دیکھ کر عقل رو دے اور علم شرمائے۔ یوں تو یہ سلسلۂ تحقیق و تدقیق تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا لیکن امسال، کہ قوم اس رہبرِ فرزانہ کا صد سالہ جشنِ پیدائش منانے میں مصروف ہے، ایسے ایسے مضحکہ انگیز نکات سامنے لائے جا رہے ہیں جنہیں دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ سوال کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا — نہ کوئی معمہ ہے نہ بھارت۔ یہ ایک صاف اور واضح حقیقت ہے کہ ہم نے پاکستان اس لئے مانگا تھا کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا تھا۔ اسلام، ایک زندہ حقیقت اور عملی نظامِ حیات بننے کیلئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ اور یہی تقاضا، مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔

بھارتیں

اب رہا دوسرا سوال، کہ اس کے حصول کے اسباب و ذرائع کیا تھے، تو چونکہ آج ہماری قوم اس تصور ہی سے بیگانہ ہو چکی ہے کہ عزم و یقین (ایمان) کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے، اور اس سے بے ساز و یراق کیسے کیسے محیر العقول کارنامے ظہور میں آ جاتے ہیں، اس لئے وہ اسے بھی نہیں سمجھ سکتی کہ حصولِ پاکستان کا راز، اس معمارِ پاکستان کے عزمِ بلند اور یقینِ محکم میں مضمر تھا۔ میں آج کی نشست میں، عزیزانِ من! اس حقیقت کی نقاب کشائی کی کوشش کروں گا کہ یہ قائدِ اعظم کے کردار کی عظمت تھی جس سے یہ "معجزہ" ظہور میں آ گیا۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریکٹر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے، اس ضمن میں ایک اہم نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو وہ اپنی گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے ان کی شہرت داغدار ہو جائے۔ لہٰذا، ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال، کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتے۔ کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اس نے ہنوز کوئی مقامِ بلند نہ حاصل کیا ہو۔ اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہے، اس میں

کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ

تصنع اور آورد نہیں ہوتی ۔ اس لئے ان میں اس کے جوہرِ کردار کی حقیقی جھلک دکھائی دے سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ نبیؐ اکرم سے مخالفین نے پوچھا کہ اس امر کی شہادت کیا ہے کہ آپ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۱۰/۱۶) میں نے دعویٰ نبوت سے پہلے، جب میری حیثیت معاشرہ کے ایک فردِ عام کی تھی، تمہارے اندر زندگی گذاری ہے۔ میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا! حضورؐ کے اس جواب نے (جو بزبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماپنے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق؛ قائداعظمؒ کے کردار کی داستان، اُن کی زندگی کے اس ابتدائی دور سے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ء سے کیا جاتا ہے جب مانٹیگو۔ چیمسفورڈ اسکیم کے سلسلہ میں، اس زمانے کے وزیرِ ہند، مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ انہوں نے، اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں تلک۔ گوکھلے۔ دادا بھائی نوروجی کے علاوہ، مسٹر محمد علی جناحؒ سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جواں سال سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کئے:

مسٹر مانٹیگو کے تاثرات

ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی، داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو پورے طور پر منوانے کا مدعی، وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کرتے ہار گیا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناحؒ کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح اُٹھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناحؒ جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔ؔ

لندن سے (بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد) مسٹر جناحؒ نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت ناسازگار تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا۔ لیکن اس پر بھی، بلحاظِ روزگار پر اس نو وارد کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ عدلیہ کے سربراہ، سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیش کش کی جس کا مشاہرہ پندرہ سو روپیہ تھا، تو مسٹر جناحؒ نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ، یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس، اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دے کر مسکرا دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک خود خندیدہ نوجوان کی خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا۔

ؔ جن اقتباسات کے حوالے نہیں دیئے گئے ان کے لئے طلوع اسلام بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۶ء ملاحظہ کیجئے۔

تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

اب آگے بڑھئے۔ پہلی جنگ عظیم کا آخری دور تھا۔ اگرچہ اس میں اتحادیوں کو بہ حیثیت مجموعی کامیابی حاصل ہو رہی تھی، لیکن ان جراحت ہائے پیہم سے برطانیہ کی حالت بسمل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم، انگریزوں اور

لارڈ ہارڈنگ کو جواب

ہندوستانیوں، دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومتِ ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناحؒ کو ایسا موقعہ خدا دے۔ وہ اس زمانے میں مسز اینی بسینٹ کی قائم کردہ، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اسی پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہلِ ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا:۔

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون گرانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں۔ آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے ...... یہ جنگ آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاترالعقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اُتر آئے؟ یاد رکھئے کہ یہ طرزِ حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناحؒ کے اس نعرۂ حریت کا اثر تھا کہ وزیرِ ہند کو علی العلان اعلان کرنا پڑا کہ:۔

> ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومتِ برطانیہ کے اس حصے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادیٔ ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو محمد علی جناحؒ کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

وزیرِ ہند نے تو حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سر پھرے انگریز حکمران تھے جو نشۂ قوت میں بدمست، اس تصور تک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سیڈنہم اور لارڈ ولنگڈن کا نام سرفہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے، اس صوبۂ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناحؒ کا مسکن تھا۔ جناحؒ نے ان دونوں سے جس بیباکانہ انداز سے ٹکر لی وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا نہایت ولولہ انگیز باب ہے۔ لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے۔ تو یہ سرمستِ بادۂ حریت، بپھرے

لارڈ سیڈنہم کے خلاف

ہوئے شیر کی طرح، ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سیڈنہم کا نام لے کر کہا کہ:-

> یہی ہے وہ رجعت پسند جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز رہا۔ جس نے ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اُس دور میں جرأت و بیباکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناحؒ کو اس کا علم تھا۔ وہ جب ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں، ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اہالیانِ شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔

لارڈ ولنگڈن سے نبرد آزمائی

مسٹر جناحؒ انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے۔ لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناحؒ نے وہاں جو شعلہ انگیز تقریر کی، اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ:-

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۵ء کا یہ دن، بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

اہلِ بمبئی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناح میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبۂ بے باکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں، ایک ہندو لیڈر مسٹر پی۔ ڈی۔ لاتم، نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:-

> کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناحؒ ہیں۔ جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناحؒ کے عزمِ صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں دادا بھائی نوروجی اور گوپال

کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے ..... انہوں نے عوام کے حقوق کی راہ نمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِ وطن کی حیثیت سے، ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تر و تازہ رہے گا ..... مسٹر جناح ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

یہ واقعہ تو لارڈ ولنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی، مسٹر جناح نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی، اس زمانہ میں، شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی، استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناحؒ کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے ایڈریس میں، اہلِ ہند سے جنگ میں

وار کونسل کے معرکے

عملی تعاون کی اپیل کی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے راہ نماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناحؒ اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے ـــــ اور ایکسیلنسی کے احترام کے باوجود میں اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی فراہم نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ..... ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریکِ کار نہ بنایا جائے۔

ضمناً۔ مسٹر جناحؒ تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے، اور، دوسری طرف مسٹر گاندھی، جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، وائسرائے کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ:۔

میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیوشنز

واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دورانِ جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادرِ ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی عزت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناح نے حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف، وار کونسل کی اسی کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ وہ مختلف مواقع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخرکار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ یہ استعفیٰ جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخِ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ:-

> حکومتِ ہند نے اور آپ نے زمانۂ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلاخوفِ تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے روند دیا ہے جن کے لئے حکومتِ برطانیہ نے جنگ لڑی تھی۔
>
> انصاف کے بنیادی اصولوں کا عین اُس وقت استیصال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔ جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ......
>
> ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو تعاون کرنا امرِ محال ہے۔
>
> میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانۂ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے۔ مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

رولٹ ایکٹ

جنگ کے خاتمہ پر، حکومتِ برطانیہ نے، اہلِ ہند کے تعاون کا صلہ اُس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے، امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں معصوم انسانوں کا قتل، ہلاکو اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خون ریزیوں کی داستانوں کو فراموش کرا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا:

> رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے۔ ایسے ہیبت ناک جرائم پر

منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی انہیں دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کانگرس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے۔

ایسے ہی تھے مسٹر جناحؒ کے جذباتِ تہوّر اور آزادی کے وہ مظاہر جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوکھلے جیسے عظیم ہندو راہ نما نے کہا تھا کہ:-

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی، وہ جناحؒ ہی کی بدولت ہو گی۔

مسٹر جناحؒ کے اس بے لوث کردار کی بنا پر، لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگرس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے مخالف تھے۔ اس دوران میں وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مدِّمقابل کانگرس کا امیدوار تھا۔ بمبئی کرانیکل چوٹی کا نیشنل روزنامہ تھا۔ اس نے ووٹروں سے مسٹر جناحؒ کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ:-

ان کی گذشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں جناحؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے۔

اور اس کے بعد کہا کہ:-

اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناحؒ جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہو گا۔

اس وقت تک ہم مسٹر جناحؒ کی زندگی کے اس حصّہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان کی ملّی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملّتِ اسلامیہ کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سرآغازِ داستاں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاستِ عالم کا موجودہ مدار میکیاولی کہلاتا ہے۔ جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا

میکیاولی سیاست

حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکاری، عیاری، وعدہ فراموشی، پیماں شکنی وغیرہ سب جائز قرار پا جاتے ہیں۔ جو جس قدر زیادہ شاطر اور چالباز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجسمے نصب کرتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار میں قائدِاعظمؒ کے مدِمقابل انگریز۔ ہندو، اور تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ہندو اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۴۸ء میں، پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۳ر نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ:۔

> کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزاروں سال مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

مہاتما گاندھی

اس ہندومت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا۔ جسے اس کی قوم مہاتما کہتی اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس مہاتما کے متعلق قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا کہ:۔

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستاں ہیں! معمہ ہیں!!
>
> طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

ابوالاعلیٰ مودودی

تیسرا فریقِ مقابل، مخالفِ پاکستان مسلمان تھا۔ اس کے اصولِ سیاست کیا تھے، اسے، تحریکِ پاکستان کے سب سے بڑے حریف، ابوالاعلیٰ مودودی کی زبانِ مبارک سے سنیئے۔ وہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن کی مئی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ میں حسبِ ذیل "اصولِ دین" بیان فرماتے ہیں:۔

(۱) زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔
(۲) تحریک کے ابتدائی دور میں بلند آہنگ اصول پیش کرنے چاہئیں لیکن جب ان پر عمل کا وقت آئے تو انہیں بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔ اور
(۳) دشمن کو قتل کرانے کے لئے، جھوٹ اور فریب سے کام لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(قیامت بالائے قیامت کہ ان میکیاولی اصولوں کو انہوں نے ـــ معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ سنتِ رسول اللہ کہہ کر پیش کیا ہے اور ایسا نہ کرنے میں نہ خوفِ خدا ان کا گلوگیر ہوا ہے، نہ رسولؐ اللہ سے شرم دامن کش!)

بہرحال یہ تھے حریف جن سے قائدِ اعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دورِ سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف۔ ان کے کسی بدسے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مکر گئے ہوں۔ صاف، سیدھی، دوٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم۔ یہی تھی ان کی وہ خصوصیتِ کبریٰ جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، دنیا کے عظیم ترین اخبار ـــ لنڈن ٹائمز ـــ نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ:۔

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

اقبالؒ کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ؎

دہی ہے بندۂ حر ضرب جس کی ہے کاری ۔۔۔ نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے! ۔۔۔ انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور اس سے ہماری نگاہ کا رخ، اقبالؒ جیسے حکیم الامت کی نظرِ انتخاب کی طرف پلٹتا ہے۔ مسٹر جناحؒ ہندی سیاست کی بوالعجبیوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین سے ہو چکے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں انگریز اور ہندو کی ملی بھگت ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے، اور مسلمانوں کے مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ انہیں، ان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہ آتا تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جاتے۔ لیکن اقبالؒ تو ایک دیدہ ور تھا اس لئے اس کی نگاہ، سطح سے نیچے اتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں اسے وہ گہر تابدار مل گیا جس

جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناحؒ کو ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائدِاعظمؒ کے احوال و کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار، اور بلندیٔ منصب کی بیّن شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس خط میں لکھا:-

علامہ اقبالؒ کا خط

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائدِاعظمؒ کی عظمتِ کردار، نیّرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہو جاتی ہے دوسری طرف وہ حکیم الامت کی دیدہ وری کی بھی بیّن شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر سچ کر دکھایا۔

عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت (CHEAP POPULARITY) حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کونسے پاپڑ بیلتے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائدِاعظم تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں، جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے، لیکن جب وہ قائدِاعظم کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے اسٹیشن سے وہ ایک کھلے رکھشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی، اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے لیکن آگے جاکر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائدِاعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔ جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر، انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے ملّی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما، "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا۔۔۔ اسلامی لباس

سے اس زمانے میں مراد " شیروانی ، شلوار یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں

شملہ کا جلوس

دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناحؒ صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو پیچھے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعۂ فال مجھ دیوانے پر پڑا ، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے قائداعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔[1] وقت کی کمی اور جذبات کی تیزی کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر ، قائداعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سنا اور اگرچہ اس سے برافروختہ ہوئے لیکن اسی سرگوشیانہ انداز سے مجھ سے کہا کہ کیا تم لوگ مجھے "مہاتما گاندھی" بنا دینا چاہتے ہو۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔ لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگی جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو۔ یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوں سے اٹھا کر زیبِ سر کر لیا ، اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گذرے؛

چونکہ — غالبؔ کے الفاظ میں — لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — اس لئے لگے ہاتھوں اس "مہاتما" کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جائیے جس کی طرف قائداعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا ، وہ ایک دھوتی پہنے ، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور دہلی میں بھنگی کالونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ گذشتہ سال (دسمبر ۱۹۷۵ء میں) لارڈ ماؤنٹ

مہاتما گاندھی کا بہروپ

بیٹنؒ کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا کہ اس نے ایک دن مسز سروجنی نائیڈو سے کہا کہ :-

> میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں ، اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ :-

> ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے ،

---

[1] میں یہاں اپنی ذات کو درمیان میں لانے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن واقعہ کیسے کم و کاست بیان کرنے کا یہی تقاضا ہے۔

انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بوڑھے آدمی" کو اس طرح مفلسی اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگریس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء

اور ایک "مہاتما" پر ہی کیا موقوف ہے۔ ان آنکھوں نے ایسے مسٹر دیکھے ہیں جو دن میں دو دو بار شیو کرتے اور سر پر انگریزی فیشن کے بال رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کے دل میں مذہبی قیادت کی ہوس نے انگڑائی لی تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاڑھی بڑھا لی اور سر پر پٹے رکھ لئے اور ایک اسلامی جماعت کے امیر بن گئے۔

بہرحال، یہ تھا قائدِاعظمؒ کا حسنِ کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ:-

جناحؒ کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔ وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔ (ایضاً)

جن لوگوں کے دل میں تحریکِ پاکستان کے خلاف خبثِ باطن اور قائدِاعظمؒ کے خلاف، آتشِ انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر، منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ ہند، انگریزوں کی اسکیم تھی اور قائدِاعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔ میں اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِاعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح للکارا اور کس طرح ہر موقعہ پر ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جب انہوں نے

انگریز کے خلاف

۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز، ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر، ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برملا کہا کہ:-

اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا۔ اس ظالمانہ اقدام

سے اس برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھینچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائداعظمؒ کے خلاف یہ الزام عائد کر دیا کہ:-

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

تو انہوں نے کھٹ سے جواب دیا کہ:-

یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری لمحہ تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے۔

قائداعظمؒ تو یہ کہہ رہے تھے، اور مسٹر گاندھی، جو قائداعظمؒ کے خلاف اس قسم کے الزامات تراش رہے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے جریدہ اسٹیٹسمین میں برطانوی سامراج کے علی حالہ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ:-

تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولاں گاہ بنا لیں گے..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست بُرد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگرسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگرس کو دعویٰ ہے۔

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا۔ اس کے برعکس قائداعظمؒ ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ:-

میں بلاخوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سامنے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس

سکے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے بنا بریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں۔ ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز، ہندوستان کے مستقبل کے متعلق، مسلمانوں کے علی الرغم کوئی اسکیم مرتب کر رہے ہیں۔ اس پر قائداعظمؒ نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا، جس میں انتہائی پُرجلال انداز میں کہا کہ:-

> میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں۔ ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار ڈیلی میل کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ:-

> مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا۔ اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔
>
> (طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۴۰ء)

اس موضوع پر میں عنوانِ بالا کی تائید میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا لیکن قلتِ وقت اس کی مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے، خبثِ باطن کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہو گئی ہوگی کہ تقسیمِ ہند کی اسکیم برطانیہ کی تخلیق تھی۔ اور قائداعظمؒ اس کے آلۂ کار بن کر کٹھ پتلی کا رول ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان شہادات میں اگر کسی اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

تقسیمِ ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، سالِ گذشتہ کے اواخر میں بی۔ بی۔ سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں، اس سے سوال کیا گیا کہ:-

کیا اُس وقت، ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اُسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے۔ تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح مکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناحؒ۔ صدر مسلم لیگ۔ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۲ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں، اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

قائداعظمؒ کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ چومکھی لڑائی اس انداز سے لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ گھیراؤ کے فسادات برپا کئے۔ نہ شورشیں اٹھائیں، نہ اینٹ پتھر برسائے۔ صرف اپنے تدبر، فراست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت لی کہ تاریخ اس پر انگشت بدنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔

گولیوں کے نشانے

تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی کلب میں، انہوں نے اپنی محترمہ بہن، مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے تھے تو میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکرات، پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں جب گھر آتا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے۔ میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپروائی سے کام نہیں لیا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا۔ ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ کہ موت تک کے مقابلہ کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے

ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا، میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔

(فاطمہ جناح ــــ "میرا بھائی" ــــ بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء ص ۱۲)

لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی انہوں نے، کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس میں اقربا نوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ قائدِاعظمؒ کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک بیٹی تھی ــــ نہایت چہیتی بیوی کی ــــ چہیتی یادگار بیٹی ــــ لیکن جب اس نے (شخصیل کے اثرات کے تحت جہاں اس نے پرورش پائی تھی) ایک غیر مسلم سے شادی کر لی تو قائدِاعظمؒ نے کہہ دیا کہ وہ اس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور جیتے جی انہوں نے اس کا منہ نہیں دیکھا۔

اقربا نوازی کے خلاف

اقربا نوازی کا ایک موقعہ ان کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمشیرہ، محترمہ شیریں بائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

> جب مرحوم چندریگر نے قائدِاعظمؒ کے لائق بھانجے، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائدِاعظمؒ کو پیش کی تو انہوں نے اُسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی نااہلیت یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔
>
> (جنگ کراچی۔ ۹ جولائی ۱۹۷۲ء۔ بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائدِاعظمؒ کے حسنِ کردار ہی کا نہیں، دور نگہی اور مآل اندیشی کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ اس کے ساتھ، یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ "اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے، لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر پورا بھروسہ ہے"۔

سامانِ جنگ

اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

> اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! میرا تمام اسلحہ خانہ اس قدر ہے ــــ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر۔ اور ایک پرسنل اسسٹنٹ۔ (بس یہ ہے ہمارا ساز و یراق اور اسلحہ اور فوج)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:۔

نگہِ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ط انہوں نے غالباً انگریزی میں (DISQUALIFICATION) کہا ہوگا۔

اس ساز و سامان کے ساتھ لڑنے والا قائد، کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائدِ اعظمؒ کے اپنے الفاظ میں:۔

> اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال، وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت، تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

لیکن ان چار میں ایک اور عنصر کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ اور وہ ہے خونِ جگر — جس کے بغیر اقبالؒ کے الفاظ میں، ہر نقش ناتمام رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبالؒ میں تو "خونِ جگر" کے الفاظ استعارہ کے طور پر

قائدِ اعظم کی صحت

استعمال ہوئے ہیں، لیکن قائدِ اعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی۔ یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دل سوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کر سکوں گا۔ آپ بھی دل تھام کر سنیئے۔ قائدِ اعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آ رہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا بیان ہے کہ:۔

> ہم ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے کچھ دنوں سے قائدِ اعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اچانک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنا شروع کر دیں جیسا کہ کسی آدمی کو گرم لوہے کی سلاخ سے چھوا جائے۔ میں اسی لمحے ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ دریافت کی اور قائدِ اعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے درد زدہ جگہ کی نشان دہی کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے درد زدہ جگہ کو ہاتھ لگایا تو نا امید ہو کر اگلے اسٹیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرمائش دینے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کروایا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تو میں نے گارڈ کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ نیپکن میں لپیٹ کر بوتل کو درد زدہ جگہ پر رکھا جس سے درد میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔
>
> ("میرا بھائی" — صفحہ ۴)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

> ۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائدِ اعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دور تھی تو قائدِ اعظمؒ اپنی نشست سے اٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کی کھڑکی سے بچتے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی، تو قائدِ اعظمؒ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تھکن اور کمزوری محسوس کرتا تھا اور پھر قائد میرے کندھوں کا سہارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے گاڑی اسٹیشن پر پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائدِ اعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور زور سے چلا کر کہا کہ زیادہ

شور نہ کریں کیونکہ قائداعظمؒ تھکان اور بخار کی وجہ سے بستر پہ ہیں دوڑ کر ڈاکٹر
لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر حاضر ہوا، اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکرمند ہونے
کی کوئی ضرورت نہیں ہے ذرا نبض گر گئی تھی۔ ("میرا بھائی" ـــ صفحہ ۳)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائداعظمؒ آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ:۔

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پہ چلا جائے جبکہ اس کی فوج
اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو! ("میرا بھائی" ـــ صفحہ ۱۳)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصدِ پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا ـــ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تندہی کے ساتھ۔ لیکن قوتِ ارادی، فطرت کے سرِ اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخرکار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس محسنِ ملت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا ـــ حتیٰ کہ اس میں، اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتمد علیہ رازداں، بہن کو بھی شریک نہ کیا۔ یہ راز، راز ہی رہتا اگر اسے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشا نہ کرتے۔ یہ ڈائری حال ہی میں (FREEDOM AT MIDNIGHT) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اپنی تیزی سے گرتی چلی جانے والی صحت کے متعلق

خاموش!

قائداعظمؒ نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے ایکسرے لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح دق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائداعظمؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکسرے کو کسی کے سامنے آنا چاہیئے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکسرے کی وہ فلم بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی سِل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سربمہر رکھنے سے مقصد کیا تھا؟ اسے، اس کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربمہر
راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیمِ ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

اس مردِ مجاہد نے، اس "حادثہ" کو رونما کرنے کے لئے، اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر، اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم نااہلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دنیا سے چلا گیا۔ ان کی وفات پر، دنیا بھر کے عظیم مشاہیر نے (جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے) انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گلہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد اہمیت کی حامل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سروجنی نائیڈو نے (قائداعظمؒ کی زندگی ہی میں ان کے متعلق) جو کچھ کہا تھا، وہ ان

کی خلوصِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ :-

میں بھی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

ناقابلِ خرید

میں ان کے اس ناقابلِ خرید کردار کی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن قلتِ وقت کی بنا پر سرِدست دو ایک واقعات پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ کے ماتحت، ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی اسکیم پیش کی گئی تو قائداعظم نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ اسکیم پروان چڑھ جائے۔ قائداعظم کو ہم نوا بنانے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِاعظم لارڈ ریمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ :-

اگر مسٹر ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب، اتنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائداعظم نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِاعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر ریمزے میکڈانلڈ بے حد متعجب ہوا، اور قائداعظم سے، الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ، یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہے ؟ قائداعظم نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ :-

اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان ۱۶)

سچ ہے :-

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیش کش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیش کش کی گئی۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد، تقسیمِ ہند کی اسکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے چوٹی کے لیڈر، مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ :-

اگر ملکِ معظم کی حکومت ایک ہنگامی نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگریس رفقاء کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیرِاعظم نامزد کر دے اور اسے قومی حکومت متشکل کرنے کا موقعہ دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناح کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی کہ وہ اسے بجا طور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ مندانہ شکی جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے

نہیں پڑا ہوا۔ (طلوعِ اسلام ۔ جون ۱۹۷۶ء)

قائداعظمؒ نے اسمبلی کی تقریر میں (جس کا شمار ان کی اہم ترین تقاریر میں ہوتا ہے) اس کے جواب میں کہا کہ:-

> اگر مسٹر ایمری (یعنی نمائندہ حکومت برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیش کش کی جاتی تو کیا یہ اس وقت بھی میری طرف سے اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ مسٹر ایمری اور راج گوپال اچاریہ' دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں۔

اور اس کے بعد، اس تقریر کے آخر میں، یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا کہ:-

اعلانِ جنگ

> ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے۔ ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ جمہوری نظام حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ہم اس کا تہیہ کر لیں تو قلتِ تعداد کے باوجود، ہم تمہارے لئے اس سے سو گنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگریس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں، بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں نہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔

اب میں، عزیزانِ من! قائداعظمؒ کی شخصیت کے ایک اور گوشے کی ہلکی سی جھلک سامنے لانا چاہتا ہوں۔ عام طور پر تاثر یہ ہے کہ وہ ایک جامد یابس قسم کے قانون دان اور منطقی مزاج انسان تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں۔ ان کی شخصیت' علامہ اقبالؒ کے اس مثالی کردار کی زندہ پیکر تھی جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ:-

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگین حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم تھا اور پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ ان کے ذوقِ سلیم کے ضمن میں اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ "گاندھی۔ جناح خط و کتابت" کے سلسلہ میں، مسٹر گاندھی نے اپنے ایک خط میں پوچھا کہ آپ فرمائیے کہ میں آپ کو کس القاب سے خطاب کیا کروں۔ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں لکھا کہ:-

> آخر میں مجھے اس بات کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ یہ جاننے کے لئے بیتاب ہیں کہ میں اپنے نام کے ساتھ کس لقب کو پسند کروں گا۔ آخر ان الفاظوں میں

رکھا گیا ہے؟ گلاب کے پھول کو کسی نام سے بھی پکار دیجئے۔ اس کی دلآویز خوشبو میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لئے میں اس معاملہ کو آپ ہی کی پسند پر چھوڑتا ہوں۔ اس سلسلہ میں میری اپنی کوئی خواہش نہیں۔ یقین فرمایئے کہ میں ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ لقب کے معاملہ میں آپ کو میرے متعلق اس قدر تشویش کیوں لاحق ہے!"

خط کے آخری فقرہ میں، مسٹر گاندھی کے تحت الشعور میں اُتر جانے والا جو نرم و نازک نشتر ہے، اس کی برجستگی کا اندازہ کوئی ماہرِ نفسیات ہی لگا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے معاملہ میں قائداعظمؒ کی یہ حسِ لطیف خاص طور پر چل جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اُچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام، مہاتما جی، شیو گاؤں میں اپنی کٹیا میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بہت بڑا سانپ کٹیا میں آ گیا۔ مہاتما جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد ایک چکر لگایا اور جس طرح چپکے سے آیا تھا، اسی طرح چپکے سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے مہاتما جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائداعظمؒ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہے۔ آپ نے کہا کہ ہاں! پڑھا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک کیا توجیہہ ہے۔ فرمایا کہ (PROFESSIONAL ETIQUETTE) یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جا سکتا ہے، تشریح نہیں کی جا سکتی۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے اور مہاتما جی کو منہ چھپائے نہ بنی۔ یہ تھی اس مردِ آہن کی حسِ لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

اور آخر میں ایک ایسا واقعہ جس کی یاد مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اکثر لوگوں کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ میری اور قائداعظمؒ کی پوزیشن میں اس قدر بُعد کے باوجود، وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے مجھے ان سے اس قدر قرب حاصل تھا۔ میرے اس زمانے کے قریبی احباب تو اس راز سے واقف تھے لیکن میں نے خود اس کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ میرے اس قرب کی وجہ تھی اُن کا قرآنی تعلق۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے سے وقت لئے بغیر، ان کی فرصت کے اوقات میں حاضرِ خدمت ہو جایا کروں۔ میں جب بھی حاضر ہوتا پیش آمدہ اہم معاملہ کے بعد، قرآنِ کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ میں نے ان جیسا ذکی الفہم انسان بہت کم دیکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ـــ خادے دیدہ احوالِ چمن گفت ـــ ذرا سے نکتہ سے پوری کی پوری بات فوراً سمجھ لیتے تھے۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں میں نے قرآنِ مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی اکرم کی ساری عمر (شریف) اپنے مقصد کے حصول میں جانگداز مشقتیں اٹھاتے...... گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر میں یہ حسین و معصوم

سی آرزو ابھری کہ بار بار! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گزر جائے گی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا کہ: إِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) "جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے، وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے۔ اس سے تجھے کچھ سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے؟ میں روا روی میں یہ کچھ کہہ تو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ان کی آنکھوں میں آنسو، بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے) یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی۔ فرمایا کہ میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستیؐ کے لئے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا، خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد ——— تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتنے لگا۔ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ اس پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے کس تارِ رگِ جان کو چھیڑ دیا؟ میں نے اس احساس کی شدت کو کم کرنے کے لئے کہا کہ نہیں! حضورؐ کے مقصد کا حصول حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ یہ الگ بات ہے۔ لیکن خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ یہ کہہ کر وہ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس وقت تو مجھے اس کا علم و احساس نہیں تھا، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس گہری سوچ میں ان کے پیشِ نظر (شاید) اپنے پارسی معالج کے سیف میں محفوظ رکھا ہوا وہ ایکس رے ہو گا جس کا تذکرہ اب ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ قانونِ خداوندی کے بے لچک ہونے کے ساتھ، ہمیں اپنے سامنے اسوۂ رسول اللہ رکھنا چاہیئے۔ حضورؐ نے اس جواب ملنے کے بعد اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنی جد و جہد بدستور رکھنی چاہیئے اور نتیجہ کا انتظار خدا کے قانون کے مطابق کرنا چاہیئے ——— ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔ اعلانِ پاکستان کے بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس عدیم النظیر کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے بعد، مندرجہ بالا واقعہ کی یاد دلائی، تو ہنس کر فرمایا کہ نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی۔ ورنہ خدا کا جواب تو بڑا دکھ پہنچانے والا تھا۔ یہ تھی قائد اعظمؒ کے قلبِ سلیم کی ایک مثال۔

یہ تھا وہ شیرِ بیشۂ حریت و صداقت جس کے آہنی عزم اور عظمتِ کردار نے وہ کچھ کر دکھایا جس پر ساری دنیا کے اربابِ دانش و بینش ششدر و حیران ہیں اور اس کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور۔ نظریۂ پاکستان کی صداقت (کہ جو اسلام ہی کا دوسرا نام ہے) اور اس کے قائد کی قوتِ ایمانی اور جوہرِ کردار۔ یہ تھیں وہ قوتیں جنہوں نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔

اس عملِ جلیل کے بعد کیا ہوا، یہ ہماری تیرہ بختی کی شبِ دراز کی دل خراش داستان ہے جسے چھیڑنے کا یہ وقت نہیں۔ سرِ دست میں اتنا کہہ کر اس خطاب کو ختم کر دینا چاہتا ہوں کہ: ؎

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

والسلام

سعد حسن بشیر
متعلم میڈیکل کالج۔ کراچی

جشنِ نزولِ قرآن

سورۂ یونس میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو قلوبِ انسانی کے تمام امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور ان لوگوں کے لئے ہو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامانِ نشوونما اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی عطا ہو گیا۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطۂ حیات نہ مل سکتا۔ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا۔ پس ایسی متاعِ گراں بہا کے یوں بے مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ۔ وہ متاعِ گراں بہا کہ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) انسان جو کچھ بھی جمع کرلے یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا۔ سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت۔

یہ ہے وہ تقریبِ جاں نواز جسے بطورِ جشنِ مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔

انسان جن مقاصد کے حصول کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے، ان میں خوشی (HAPPINESS) کا حصول ایک بڑا مقصد ہے۔ اتنا بڑا کہ بعض مفکرین نے اسے انسانی کاوشوں کا بنیادی محرک قرار دے دیا۔ ان کے نزدیک خوشی یا مسرت و انبساط کے حصول کا جذبہ ہی ہر انسانی عمل کا بنیادی محرک ہوتا ہے۔ لیکن ان مفکرین کو حقیقی مسرت اور اس مسرت کو پیدا کرنے والے عوامل کا سراغ نہیں مل سکا۔

خوشی تو ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو خارجی یا اندرونی محرکات کی وجہ سے انسانی قلب کو جنت بنا دیتی ہے۔ اور جنت بھی تو دراصل ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس کا ایک پہلو خوشی و مسرت کی انتہا ہے۔ لیکن انسان کو خوشی حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے مفکرین اور ماہرینِ نفسیات نے طرح طرح کے نظریات وضع کئے۔ لیکن تصور کیجئے ایسے شخص کا جو راستے سے بے خبر اندھیرے میں، اَن دیکھی رکاوٹوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہو اور اسے روشنی کی کوئی

کون نظر نہ آتی ہو۔ ایسے ماحول میں اسے اچانک ایک ایسا راہبر میسر آ جائے جو چاروں طرف نور بکھیر کر اُسے صحیح راستے کی طرف لے چلے۔ تو ایسے شخص کی اس وقت خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟ کون اس کی مسرت و فرحت کا اندازہ کر سکتا ہے؟

بغیر وحی کے انسانوں کی حالت بھی اندھیرے میں بھٹکے ہوؤں کی سی ہو جاتی ہے۔ انسانیت کی یہی شبِ تیرہ و تار تھی جس میں قرآن نور بن کر آیا۔ (اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْمُبٰرَكَةِ) اور چار سو اپنی ابدی روشنی بکھیر کر انسانیت کو اجالوں میں لے آیا۔ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۲/۲۵۷) اور اُسے نہ صرف صحیح راہ دکھا دی بلکہ منزل کا تعین بھی کر دیا، تو کیا انسانیت کے لئے یہ حقیقی خوشی کا مقام نہیں۔ اور یہی نہیں، قرآن کو زمانی و مکانی حدود و قیود سے بالاتر کر کے انسانوں کو ہمیشہ کے لئے سکون و اطمینان کی مسرتیں بخش دی گئیں کہ یہ چراغِ راہ کبھی نہیں بجھے گا۔ اور یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابلِ اعتماد ہے۔ ایسا سہارا جو لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ (سورۃ المائدہ) تمہاری طرف اللہ کی جانب سے ایک روشنی آ گئی۔ یعنی واضح کتاب۔ روشنی، جو خود نظر آتی ہے اور جسے تلاش کرنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں۔ اس سے — يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ: خدا ان قوانین کا اتباع کرنے والوں کو اس کتاب کے ذریعے سلامتی کی راہوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے اور يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ۔ اور اپنے قانون کے مطابق انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵/۱۵-۱۶) اور زندگی کے توازن بدش راستے کی طرف لے جاتا ہے۔

اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چلاتے ہوئے قرآن، انسان کو اُس جنت تک پہنچا دیتا ہے جس کے دروازے کی پیشانی پر لکھا ہے:۔

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۷)

جو اُس میں داخل ہو گیا اس نے امن و سلامتی پا لی۔ وہ امن جس کے فقدان سے انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ وہ سلامتی یہاں حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انسان کو پکارا جاتا ہے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا (۱۵/۴۶-۴۷)

اس میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اس میں داخل ہونے والوں کے دلوں سے وہ تمام کدورتیں دور ہو جاتی ہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے محسوس یا غیر محسوس طور پر باہم متحارب رکھتی ہیں، اور وہ خلوصِ قلب سے ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔ یوں قرآن انسان کی ذہنی پیچیدگیوں اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج کر دیتا ہے۔ بقائے دوام حاصل کرنے اور ارتقاء کا صحیح طریق معلوم ہو جانے سے انسان ان "سینے کی بیماریوں" سے شفا حاصل کر لیتا ہے۔ (شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ) اور یوں زندگی کے ہر گوشے

میں "سلام" کی کیفیت کی نمود دیکھ لیتا ہے۔

سلام کی کیفیت ـــــ خوف و حزن سے آزادی: ہر نوع کی غلامی سے آزادی، یہ ہوا سلبی پہلو۔ اور پھر ایجابی کیفیت۔ تکمیلِ ذات کی انتہائی شکل کی طرف پیہم ارتقا جو کہ ضبطِ خویش اور احترامِ آئین و قوانینِ خداوندی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ سلام کی کیفیت جو قرآن عطا کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے بعثتِ محمدیہ کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ:۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)

وہ نوعِ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کرا دے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ اور وہ بوجھ اس کے سر سے اتار دے گا جس کے نیچے وہ دب رہی تھی۔ قرآن نے ان تمام اطواق و سلاسل کو توڑ کر رکھ دیا جو صدیوں سے انسان کی آزادی کو سلب کئے ہوئے تھے۔ خواہ یہ سلاسل ملوکیت کے استبداد کی شکل میں ہوں، یا پیشوائیت کے تقدس کے رنگ میں۔ خواہ یہ حسب نسب اور رنگ و نسل کی تفریق کی صورت میں ہوں یا اقتصادی طبقاتی تقسیم کے ہتکنڈے۔ قرآن مجید نے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر اسے آزادی کی فضائے بسیط میں کھلا سانس لینے کی نعمت عطا کی۔ اس آزادی کا حامل ہو کر انسان صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے اس دارِ امن میں پہنچ جاتا ہے جہاں اسے اس بات پر یقین آ جاتا ہے کہ:۔

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

اس طرح اس مغلوبِ گماں کے اندر ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ وہ انسان جو بحر و بر کی وسعتوں کو مٹھی میں سمیٹ لیتا ہے۔ آسمانوں کی بلندیاں جس کے لئے فرشِ راہ بن جاتی ہیں۔ اور ساری کائنات اس کے ـــــ یعنی خدا کے متعین کردہ ـــــ مقاصد کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہو جاتی ہے۔ تب وہ پکار کر کہہ دیتا ہے:۔

زمیں خاک درِ میخانۂ ما فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اس جوہرِ خفتہ کی نمود سے جو خوابیدہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں، ان سے کام لے کر وہ جنت تشکیل پا جاتی ہے جہاں ہر سمت تازگی اور شگفتگی کی کلیاں مسکراتی ہیں۔ جہاں ذرّے ذرّے سے ذوقِ نمو پھوٹتا ہے۔ جہاں "قوتِ تخلیق" انسان کو ارتقا پذیر رکھتی ہے۔ جہاں نہ تو شکوک و شبہات اور وسوسے دلوں میں کلبلاتے ہیں اور نہ ہی کام میں تکان و افسردگی کا شائبہ تک ہوتا ہے۔ سب طرف سکون و طمانیت کے نور سے بھرپور سلاماً سلاماً کی صدائیں گونجتی ہیں۔ یہ وہ جنت ہوتی ہے جہاں نہ کوئی فغفور و خاقان ہوتا ہے اور نہ کوئی فقیرِ رہ نشیں۔ اس لئے کہ وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:۔

آب و نانِ ماست از یک مائدہ دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

یہاں ہر شخص مصروفِ عمل ہوتا ہے لیکن اس کی سعی و کاوش کے ماحصل کا مالک کوئی نہیں ہوتا:۔

بندۂ مومن امیں، حق مالک است غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

ہر فرد یہاں دوسروں کی بہبود کی فکر میں مصروفِ کار رہتا ہے کیونکہ نمودِ خویش کی کشودِ ہمہ اس نظام کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اور اس لئے ہر شخص خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر ہوتا ہے۔ ساری تعلیم کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ سے

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

یہ ہے وہ نظام جو قرآن عطا کرتا ہے اور جس میں اس کے اصول، جماعتی حیثیت سے، باہمی مشاورت کے ذریعے نافذ کئے جاتے ہیں۔ فلہٰذا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷/۹) یقیناً یہ قرآن کاروانِ انسانیت کی اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو 'اقوم' ہے۔ اقوم —— وہ باتوازن قیام جو سب سے زیادہ تعمیری کیفیت کا حامل ہو۔ جو توازن و تناسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو جو بہترین اعتدال کا حامل ہو۔ یعنی قرآن اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو خود قائم ہے اور دوسروں کے قیام کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ جو هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، ہدایت، باعثِ نشو و نما ہے۔ اور یہ ہیں وہ نعمتیں جو اس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور انہی کے ملنے پر جشنِ مسرت منایا جاتا ہے۔

انسان کی تمام نفسیاتی بیماریاں اور قلبی عوارض دراصل ابلیس و آدم کی اس کش مکش کے آئینہ دار ہیں جو روزِ ازل سے جاری ہے انسان کے جذبۂ تغلب و تحفظِ خویش کو —— جو اس کا جبلّی تقاضا ہے —— عقلِ بے باک (ابلیس) اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرکے فساد برپا کر دیتی ہے۔ قرآن نے انسان کو ابلیس اور شیطان —— مایوسی اور سرکشی —— جو ایک ہی سکّہ کے دو رخ ہیں۔ پر غالب آنے کا طریقہ بتایا اور اسی میں اس کی نفسیاتی، ذہنی اور قلبی پیچیدگیوں کا حل رکھ دیا۔ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ —— ایسی شفاءِ کامل جس سے انسان ان عوارض سے بلند ہو کر ابلیس سے پنجہ آزمائی کرتا ہے اور اس کو لگام دے کر اپنا زیرِ نگیں کر لیتا ہے۔ یہ قرآن کے ذریعے ہی ممکن ہے ($\frac{۲۳}{۹۸-۹۷}$ اور $\frac{۷}{۲۰۰-۲۰۲}$) یہ تنہا انسان کے بس کی بات نہیں سے

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

ابلیس دل کی گہرائیوں، نفس کی پنہائیوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے سے

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی
خویش را براہرمن باید زدن تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن

کیا یہ امر خوشی و مسرت کے ہزار جشنوں کا موجب نہیں کہ وہ آدم جو ازل سے اپنی عقلِ بے باک کی سرکشی اور مایوسی کے پیدا کردہ طوفانوں اور طغیانیوں میں تنکے کی طرح ڈوبتا ابھرتا اور پرِ کاہ کی طرح اڑتا پھر رہا تھا، اس کے ہاتھ میں وہ محکم سہارا دے دیا گیا، جسے تھام کر اس نے اِس طوفان کے آگے بند باندھ دیئے۔ اپنے سینے میں موجزن، اپنے بس سے باہر اس طوفان کو تھام لیا۔ ایسا طوفان جو اس کے علم و عقل

پر اس بلا خیزی سے آناً فاناً چھا جاتا ہے کہ اسے پتہ چلنے سے پیشتر وہ اس میں بہہ چکا ہوتا ہے۔ کیا اس شفاءِ صدور کے ملنے پر انسان جشنِ مسرت نہ منائے؟ یہ جشنِ مسرت تو قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ خوشی کے یہ چشمے از خود پھوٹتے ہیں اور انسان پکار اٹھتا ہے کہ بلاشبہ خدا نے صحیح کہا ہے کہ:

فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

قرآن انسان کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے۔ ظلمت، تاریکی جس میں نہ کوئی شے اپنی حقیقی شکل میں نظر آتی ہے اور نہ اس کے صحیح مقام کا پتہ چلتا ہے۔ اور نور ــــ روشنی، جہاں ہر شے صحیح شکل میں اپنے اصلی مقام پر نظر آ جاتی ہے۔ زمانہ، نزولِ قرآن سے پیشتر کی "لیل" کی تاریکیاں اس قدر گھٹا ٹوپ تھیں کہ انسان نہ تو خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے اصلی مقام سے آگاہ تھا۔ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا، اور کہا کہ: ؎

نہ تو زمیں کیلئے ہے نہ آسماں کے لئے!
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کیلئے

یہ ہے قرآن کی تعلیم کا ماحصل، اور اس کا مقصود و منتہیٰ۔ وہ نعمتِ عظمیٰ جس کے آگے تمام آفاق ہیچ ہے۔ جب انسان اپنے اس صحیح مقام کو دیکھ لیتا ہے تو تمام تاریکیوں کو چھٹا دیتا ہے۔ تمام اغلال و سلاسل کو توڑ دیتا ہے اور ہر غلامی سے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام عوامل جو اس کو غلام رکھتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ: ؎

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست
چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست!

پھر قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے کہ یہ کتاب تو ہے خدا کی، مگر ذکر اس میں خود انسان کا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۲۱/۱۰)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب بھیجی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے۔

اس طرح قرآن انسان کا ترجمان ہے۔ یہ ہے ذکر کا ایک مفہوم۔ لیکن ذکر کے ایک اور معنیٰ بھی ہوتے ہیں۔ شرف و مجد، عظمت و توقیر۔ چنانچہ قرآن میں خود انسان کے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے اور یہ ہمیں عزت و تکریم کا مقام عطا کرنے بھیجا گیا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ انسان کو الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ دیا گیا ہے جسے وہ انسانی نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں اس قدر وسیع ممکنات مضمر ہیں کہ ان سے انسان زندگی کی بلند سے بلند ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ ممکنات موجود تو ہیں لیکن غیر نشو و نما یافتہ شکل میں اور ان کو ارتقا پذیر کرنا ہی زندگی کا مقصد ہے۔

ارتقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کوئی سمت ہو، کوئی مقصد ہو اور کوئی متعین منزل ہو۔ انسان

کی انتہائی منزل ہمارے شعور کی موجودہ سطح سے بالاتر ہے کیونکہ اس کے بارے میں اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا۔ لیکن اس زندگی میں یہ مقصد صفاتِ خداوندی کا اپنی ذات میں علیٰ حدِ بشریت منعکس کرنا ہے۔ اس طرح انسان صِبْغَۃُ اللّٰہِ میں رنگا جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ منزل آجاتی ہے جہاں، کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

کی زندہ تفسیر بن جاتا ہے۔ اس کا عملی نمونہ سیرت محمدیہ نے پیش کیا۔ اسی سیرت کے نقشِ قدم پر چلنے سے انسان اس مقام تک پہنچتا ہے جو قرآن نے اسے عطا کیا ہے۔ اور جس پر جشن منانے کی تاکید کی ہے۔ وہ مقامِ محمدی کیا ہے جس کی رفعتوں کی امین "سیرت" ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ سورۃ والنجم پر نگاہ ڈالئے۔ اس کی ابتدائی آیات اس طرح اس مقام کی بلندیوں کو سامنے لاتی ہیں!

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی (۵۳/۱) طلوع ہونے والا ستارہ، جب وہ اپنا سفر طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے کہ: مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (۵۳/۲) تمہارا یہ رفیق سفر نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور نہ ہی راستہ پانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (۵۳/۳) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۴) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔ گویا قرآن خالصتاً، بلا آمیزشِ فکرِ انسانی، خدا کا کلام ہے۔ یہ ہیں وہ خارجی حقائق، (OBJECTIVE TRUTHS) جن کی تلاش میں انسان ازل سے غلطاں و پیچاں رہا ہے اور جن کو پانے کے لئے انسان کی عقل نے صدیوں تجربات کئے ہیں اور ٹھوکریں کھائی ہیں۔

یہ سوال کہ زندگی کے سفر میں انسان خود اپنا خضرِ راہ ہو سکتا ہے یا اس کی رہنمائی کے لئے کسی خارجی روشنی کی بھی ضرورت ہے، بڑا اہم اور بنیادی ہے۔ اربابِ فکر و نظر قرنہا قرن اس پر غور و فکر کرتے رہے اور اس کا آج یہ نتیجہ نکل آیا ہے کہ مفکرین نے تسلیم کر لیا ہے کہ عقلِ انسانی تنہا انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں، اس لئے کہ:-

فروغِ دانشِ ما از قیاس است ۔۔۔ قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد ۔۔۔ سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

گویا انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تنہا عقل کی رہنمائی میں حقائق کا کلی ادراک کر سکے۔ یہ محض مشیتِ الٰہی ہے جو اپنے پروگرام کے مطابق متعین وقت پہ، حقیقت کو تماماً و کمالاً اس منتخب و برگزیدہ ہستی پر جسے اس غرض و مقصد کے تیار کیا جاتا ہے، منکشف کر دیتی ہے۔ حیات کے سربستہ راز اس پر کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ اس طرح قلبِ کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں اتر کر اس سوال کا جواب اپنے سامنے پاتا ہے جس کی تلاش میں انسان یوں مضطرب و بیتاب چلا آ رہا ہے۔ گویا یہ بنیادی سوالات کہ میں کون ہوں؟ میرا مقام کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ خارجی کائنات کا

مقصد کیا ہے؟ انسان سے جواب طلب کرتے ہیں لیکن ان کے جوابات عقل کے محدود دائرہ سے باہر ہیں۔ اللہ خدا نے اپنی رحمت سے انسانوں کو عطا کر کے انہیں صحیح منزل کی جانب جانے والی راہ دکھا دی۔ تبھی تو کہا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اسے خدا نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں دے دیا ورنہ انسان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ اپنی عقل و خرد اور اپنے کسب و ہنر سے انہیں دریافت کر لیتا۔

کیا یہ مقام جشن مسرت نہیں کہ وہ علم جو انسان خود کبھی حاصل نہ کر سکتا اور جس کے بغیر وہ اس تباہی سے دوچار ہو جاتا جس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں، یوں بلا مزد و معاوضہ مل جائے؟ یہ علم حقیقت عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵۳/۵) نبی کو اس ہستی نے دیا جو زبردست قوتوں کی مالک ہے اور اسی لئے جو معاشرہ قرآن کے قوانین کے مطابق چلتا ہے اسے ان قوانین کے نتائج و ثمرات یقیناً حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ مکافات عمل کے قانون سے آگاہی بھی قرآن ہی کا عطیہ ہے۔ ان نتائج کا حصول مختلف طریقوں سے ہوگا کیونکہ حالات زمانے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ قرآن تو مکانی و زمانی حدود سے بلند ہے اس لئے کہ یہ اس خدا کا قانون ہے جو ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳/۶) ہے یعنی زندگی کی تمام گتھیوں کا مالک، زمان و مکان دونوں اعتبار سے انسانی زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور اس کی نشو و نما کا پورا پورا انتظام کرنے والا۔ یہ ہیں وہ تقاضے جن کا انسان کبھی احاطہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ زمان و مکان میں مقید ہے۔ ان حدود سے ماوراء قرآن ہی ہو سکتا ہے۔

اور وہ نبی جس کا سینہ اس عظیم الشان پیغام کا مہبط بنا تھا، اس کی کیا خصوصیت تھی فَاسْتَوٰى (۵۳/۶) وہ جس میں انسانی ذات کی معراج کبریٰ کی ساری تابانیاں مرتکز ہو گئی تھیں۔ صفات خداوندی کو علیٰ حدِ بشریت پورے حسن تناسب اور اعتدال کے ساتھ۔ اور پھر وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳/۷) اس کا علم اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچ گیا تھا اور وہ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔

ہمارے لئے اور تمام انسانیت کے لئے رسولؐ کی زندگی ہی اکمل ترین اور احسن ترین نمونہ ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے وہ مقام آتا ہے جہاں وہ نعمت کبریٰ سامنے آجاتی ہے جو قرآن کا حقیقی عطیہ ہے۔ یعنی انسان کا صحیح مقام۔

خدا کا قانون کائناتی رفتار سے اپنے زور دروں سے اوپر چڑھتا ہے۔ انسان کی رفاقت اسے خارجی قوت کا سہارا دے کر جلد تر بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) یہ ہے انسان کا مقام جو قرآن عطا کرتا ہے۔ رفیق خدا۔ خدا اور انسان کا حسین ترین تعلق، رشتہ رفاقت ہے۔ یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں ان الفاظ سے اشارہ کیا۔ هُوَ الرَّفِيْقُ الْاَعْلٰى۔ خدا رفیق اعلیٰ ہے۔ خدا رفیق اعلیٰ اور انسان رفیق ادنیٰ۔

یہ ہے بلندی و رفعت کا وہ حیرت افزا مقام جسے قرآن نے انسان کو نبوت محمدیہؐ کے ذریعے عطا کیا۔ فرمائیے کہ کیا اس کے بعد بھی مسرتوں اور خوشیوں کا جشن نہ منایا جائے؟

اسی جشن کو عام اصطلاح میں عید کہا جاتا ہے کیونکہ یہ (ہر سال) بار بار آتا ہے۔ ہنگامی اور وقتی نہیں۔ جب تک اس کرۂ ارض پر انسان موجود ہے یہ جشن منایا جاتا رہے گا، اور جوں جوں اس کے علم و شعور کی سطح بلند ہوتی جائے گی وہ اس جشن کو زیادہ سے زیادہ تابناکیوں کے ساتھ منائے گا اور وہ وقت آئے گا جب عالم انسانیت ہی یہی جشن منانے کے قابل رہ جائے گا۔

والسلام

طلوعِ اسلام کی انیسویں سالانہ کنونشن

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن امسال بتوفیق ایزدی بتاریخ ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار) حسبِ سابق بمقام ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور، منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے، نہ ہی اس کا کوئی اپنا فرقہ ہے، نہ اُمّت سے الگ کوئی مسلک، نہ ہی یہ ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر و تعلیم کا عام کرنا ہے، تاکہ اس سے قوم کے قلب و دماغ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے قرآنی خطوط پر صحیح اسلامی نظام کے قیام کے لئے فضا سازگار اور زمین ہموار ہو جائے۔

کنونشن کے کچھ اجلاس تو مندوبین تک محدود ہوتے ہیں اور کچھ کھلے اجلاس، جن میں عام سامعین بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاسوں میں، علاوہ دیگر مقالات، پرویز صاحب کے خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت کے اندازہ کے مطابق کھلے اجلاسوں کا پروگرام یوں ہو گا۔

۱۔ ۲۱ اکتوبر، جمعرات، شام چھ بجے۔ پرویز صاحب کا افتتاحی خطاب جس میں وہ موجودہ عالمگیر بداخلاقی، بدعنوانی، لاقانونیت اور تخریب کاری کے اس جہنم کا تجزیہ کریں گے جس میں اس وقت ساری دنیا بالعموم اور پاکستان بالخصوص ماخوذ ہے۔

۲۔ جمعہ ۲۲ اکتوبر۔ بعد نمازِ جمعہ۔ حالاتِ حاضرہ کے متعلق، مختلف موضوعات پر، فکر انگیز، بصیرت افروز اور سنجیدہ تحقیقاتی مقالات۔

۳۔ جمعہ ۲۲ اکتوبر۔ بعد نمازِ مغرب۔ مجلسِ استفسارات جس میں پرویز صاحب سامعین کے سوالات کا قرآنی روشنی میں جواب دیں گے۔ یہ محفل بڑی معلومات افزا اور پرکشش ہوتی ہے۔

۴۔ ہفتہ ۲۳ اکتوبر۔ دوپہر۔ مجلسِ مذاکرہ جس میں قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کے نمائندے اپنے خیالات کا اظہار نہایت بے باکی لیکن انتہائی سنجیدگی سے کریں گے۔ امسال مذاکرہ کا موضوع ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

۵۔ اتوار ۲۴ اکتوبر۔ پہلا اجلاس صبح (قریب ۹ بجے) اور دوسرا (آخری) اجلاس شام بعد نمازِ مغرب۔ یہ دونوں اجلاس پرویز صاحب کے خطابات کے لئے مختص ہوں گے جن میں وہ پاکستان اور اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش کا انکشاف کریں گے۔

نوٹ

یہ پروگرام مشروط ہے۔ حتمی اور تفصیلی پروگرام وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گا۔ کنونشن میں مستورات کے لئے پردہ کا انتظام ہوگا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور)

حقائق و عبر

۱۔ اقوامِ عالم کا رُخ قرآن کی طرف

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کا پیش کردہ نظامِ حیات (الدین) انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آ کر رہے گا۔ اس غلبہ کی ایک شکل تو وہ تھی جو اسلام کے صدرِ اوّل میں نمودار ہوئی جب ایک جماعت (مومنین) نے ایک ایسی مملکت کی تشکیل کی جس میں قرآنی نظام کی عملداری تھی۔ (اس قسم کی مملکت کی عدم موجودگی میں) اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ دنیا اپنے نظام بناتی جائے اور ان پر تجربہ کر کے دیکھ لے۔ تجربہ سے ہر نظام ناکام ثابت ہوگا اور اس ناکامی کے بعد، انسانوں کا جو قدم اُٹھے گا، اس کا رخ قرآنی نظام کی طرف ہوگا۔ اس طرح بتدریج قرآنی نظام، انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر غالب آ جائے گا۔

قرآنی نظامِ حیات کی ایک شق یہ بھی تھی کہ زمین تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں ــــ خواہ یہ ملکیت عام افراد کی ہو اور خواہ صاحبِ اقتدار طبقہ کی جسے عصرِ حاضر میں "مملکت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا نے اس قرآنی اصول سے اجتناب برتا، اور زمین ذاتی ملکیت میں دے دی گئی۔ تجربہ نے اقوامِ عالم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے۔ اس کے متعلق صرف ایک واقعہ کو سامنے لائیے۔ حال ہی میں، اقوامِ متحدہ (U.N.O) کے زیرِ اہتمام ایسا کانفرنس منعقد ہوئی جسے "تاریخ کی سب سے بڑی کانفرنس" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی (۱۳۴) اقوام کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ابتدائے جون میں اس کا ایک اجلاس کینیڈا میں منعقد ہوا جس میں، متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں کہا گیا کہ زمین کو ذاتی ملکیت میں دے دینے سے جو سماجی ناانصافیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا ازالہ اور تدارک ناگزیر ہو گیا ہے۔ لہٰذا، اس نظام کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ورنہ آنے والی نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ (بحوالہ روزنامہ مسلم، کراچی۔ مورخہ ۱۱ر جون ۱۹۷۶ء)

اس کانفرنس نے معاشرتی ناانصافیوں کے بنیادی سبب، کی تشخیص تو صحیح کی ہے لیکن اس کے علاج کے لئے ان کی تجویز لامحالہ یہ ہوگی کہ زمین (یا دیگر ذرائعِ رزق) کو ذاتی ملکیت سے نکال کر مملکت کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ لیکن اس سے ان خرابیوں کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اس کا صحیح علاج اس کے سوا

کچھ نہیں کہ مملکت، زمین کا نظم و نسق اپنے ذمے لے اور اس سے حاصل شدہ رزق کی تقسیم قرآنی اقدار کے مطابق نوع انسان کی پرورش کے لئے کرے۔ یاد رکھئے۔ نظام یا قانون کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ میکانکی طور پر نافذ کرنے سے اس کے صحیح نتائج کبھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کا تقاضا دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اسی کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا کو ایک نہ ایک دن اس نظام کی طرف آنا پڑے گا۔

۲۔ خداداد دولت کا مصرف!

روزنامہ نوائے وقت (راولپنڈی) کی ۹ رمئی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں حسب ذیل شائع شدہ خبر، عبرت و عظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔

> زیورچ ۸ رمئی (اے پ پ) کل سوئٹزرلینڈ میں ہیروں کی نیلامی میں سعودی عرب کے ایک خریدار نے ۴۴ء۲۴۲ قیراط وزن کے گلابی رنگ کے ہیرے کے لئے ایک ارب بچانوے لاکھ ڈالر کی بولی دے کر دنیا میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ کمپنی کے ایک ترجمان کے مطابق اس ہیرے کی قیمت کا اندازہ چھ لاکھ ڈالر تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک گلابی رنگ کے ہیرے کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ بولی دی گئی ہے۔ نیلام میں جاپان اور یورپ کے بولی دینے والے بھی تھے۔ ایمسٹرڈیم کے ایک سوداگر نے جو سعودی عرب کے خریدار کی نمائندگی کر رہا تھا، ابتدا میں تین لاکھ بیس ہزار ڈالر کی بولی دی۔ لیکن تین منٹ کے اندر اندر اس نے ایک ارب ۹۵ لاکھ ڈالر تک پہنچا دی۔ ہیرا خریدنے والے سعودی باشندے کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔

یہ اس مملکت کے باشندے کی زندگی کا ایک واقعہ ہے جس کے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہاں اسلامی قانون شریعت رائج ہے! ہمارے ارباب مذہب کے نزدیک، قانون شریعت کا دائرہ چور کے ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو سنگسار کر دینے تک محدود ہے۔ سیاست اور معیشت کا تعلق دنیاوی امور سے ہے۔

۳۔ اب اپنے گھر کی طرف آیئے

نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۷ ستمبر میں مرکزی اسمبلی کے ایک اجلاس کی روئداد کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:

> وفاقی وزیر تعلیم مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے آج قومی اسمبلی کو بتایا کہ ۷۶-۱۹۷۵ء اور ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران قائداعظمؒ کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے لئے ایک کروڑ نوے لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ وقفہ سوالات کے دوران، ایک سوال کے جواب

یں وفاقی وزیر نے کہا کہ اس میں سے نوّے لاکھ روپیہ صوبائی حکومتوں نے دیا ہے۔
۱۵ جون ۱۹۷۶ء تک پندرہ لاکھ، بیالیس ہزار روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔
انہوں نے کہا کہ اخراجات کا تخمینہ دو کروڑ (۸۹) لاکھ روپے ہے۔

قائداعظمؒ کا مقام بے شک ایسا ہے کہ ان کے پیش کردہ نظریۂ پاکستان کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس سے دس گنا زیادہ رقم بھی خرچ کی جائے تو حق بجانب ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس پروگرام کے ذمہ دار حضرات نے اتنا دیکھنے کی زحمت بھی گوارا کی ہے کہ جو کچھ اس ضمن میں خرچ ہوا یا ہو رہا ہے، اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوا ہے۔ اس جشن کے لئے ۱۹۷۶ء کا پورا سال مختص کیا گیا تھا جس میں سے نو ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس نو ماہ کے عرصہ میں، نظریۂ پاکستان یا قائداعظمؒ کی سیرت و کردار کے متعلق قوم کی معلومات میں کچھ بھی اضافہ ہوا ہے؟ ہمارے مطالعہ اور اندازہ کے مطابق اس کا جواب نفی میں ہے۔ عوام کو تو چھوڑیئے۔ آپ درسگاہوں (اسکولوں اور کالجوں) میں طالب علموں سے دریافت کیجئے کہ اس پروگرام کے نتیجہ میں ان کی معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ بات صاف ہو جائے گی۔ باقی رہے اخبارات میں چھپنے والے مضامین، تقریبات میں کی گئی تقریریں، یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشر کردہ انٹرویو وغیرہ تو ان سے تو یہی نظر آیا کہ یہ تمام کوششیں یہ تاثر پیدا کرنے میں صرف کی جا رہی ہیں کہ قائداعظمؒ، متحدہ قومیت کے حامی۔ سیکولر نظامِ حکومت کے داعی اور سوشلزم کے نقیب تھے۔ اس سلسلہ میں ہم اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اگر قوم کی ابھرنے والی نسل کے ذہن میں تحریکِ پاکستان کے قائد کے متعلق، اس قسم کا تصور جاگزیں ہو گیا تو پھر اس مملکت کا جداگانہ وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس کے جداگانہ وجود کی وجۂ جواز، دو قومی نظریہ، مملکت میں اسلامی نظام کا قیام، اور غیر قرآنی نظام ہائے سیاست و معیشت کا استرداد تھی۔ اور قائداعظمؒ نے انہیں نظریات کی بنیاد پر، انہی مقاصد کے لئے اس مملکت کو حاصل کر کے دیا تھا۔ جب اس مملکت کی یہ وجہِ جواز باقی نہ رہے گی تو یہ مملکت کیسے باقی رہ سکے گی؟

۴۔ کوّا حلال ہے یا حرام؟

مسلمانانِ عالم پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہے، ایک طرف اسے دیکھئے۔ اور دوسری طرف یہ کہ ہمارے علمائے کرام خیر سے کن اہم مسائل کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ اخبارات میں یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ ضلع سرگودھا میں، ہزاروی گروپ سے متعلق مولوی صاحبان نے یہ ثابت کیا کہ کوّا حلال ہے، اور پھر اس نظری فتویٰ کو عملی شکل دینے کے لئے کوّے ذبح کئے اور ان کا گوشت پکا کر کھایا۔ اس کے بعد اب مختلف فرقوں میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ ——— کوّا حلال ہے یا حرام۔

(بحوالہ ہفت روزہ انصاف۔ راولپنڈی۔ مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۷۶ء)

اب دیکھیں یہ بحث آگے چل کر کیا رنگ پکڑتی ہے؛ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:-

مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے امام میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا

۵- مودودی کی زندگی کا پس منظر

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، کا شمار ملک کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ وہ مدرسہ عربیہ، نیو ٹاؤن، کراچی کے بانی اور وفاق المدارس عربیہ کے صدر ہیں۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے ماہنامہ بینات (کراچی) کی اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، عنوانِ بالا کے تحت حسبِ ذیل شذرہ شائع کیا ہے، جسے ہم روزنامہ صداقت (کراچی) مورخہ ۲۵ راگست ۱۹۷۶ء کے حوالہ سے درج ذیل کرتے ہیں:-

مودودی صاحب بچپن ہی سے طباع و ذہین مگر معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ ابتداً میں اخبار مدینہ بجنور میں ملازم ہوئے اور پھر دہلی میں جمعیت علماء ہند کے اخبار "مسلم" سے وابستہ رہے اور پھر چند سالوں کے بعد اخبار "الجمعیۃ" دہلی میں ملازم ہوگئے جو جمعیت علماء ہند کا ترجمان تھا دہلی سے نکلتا تھا غالباً سہ روزہ تھا۔ تاریخ کے جواہر پاروں کے عنوان سے ان کے مضامین بہت آب و تاب سے نکلتے تھے۔ اس طرح مودودی صاحب کی علمی تربیت مولانا احمد سعید صاحب کے ذریعے ہوتی گئی۔ والد مرحوم کی وفات کی وجہ سے اپنی تعلیم نہ صرف یہ کہ مکمل نہ کر سکے بلکہ بالکل ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں میں رہ گئے۔ نہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہوسکے پرائیویٹ انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی سے کچھ مناسبت ہوگئی۔ اس دور کے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریرات اور مجلات و جرائد سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا اور علمی قابلیت روز افزوں ہوتی گئی۔ بدقسمتی سے نہ کسی دینی درس گاہ سے فیض حاصل کر سکے نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے نہ کسی پختہ کار عالم دین کی صحبت نصیب ہوسکی۔ اور ایک مضمون میں خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ بہت عرصہ ہوا کہ ہندوستان متحدہ میں مولانا عبدالحق مدنی مراد آباد کے جواب میں شائع ہوا تھا بلکہ نیاز فتحپوری جیسے ملحد و زندیق کی صحبت نصیب ہوئی ان سے مدتوں رہی ان کی صحبت و رفاقت سے بہت کچھ غلط رجحانات و میلانات پیدا ہوگئے۔ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن جاری کیا۔

حضرت مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالم عربی داں مل گئے جنہوں نے کتابیں تالیف کیں ان میں عوام الناس کو متاثر کرنے کے لئے سود خوری، شراب نوشی، پردہ، وغیرہ پر اچھی کتابیں تالیف کیں الغرض ہر کتاب مودودی صاحب اپنے

نام سے چھپواتے رہے۔ دوسروں کی قابلیت سے خود وجاہت کا فائدہ اٹھایا ـــــ ورنہ مودودی خود عربی لکھنے سے معذور، انگریزی لکھنے سے معذور ہے نہ عربی لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ یہی انگریزی کا بھی حال ہے۔ لیکن جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کے سرورق پر بھی لکھا گیا۔ تالیفات المودودی۔ کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ ترجمہ مسعود عالم کا ہے یا عاصم حدّاد کا ہے۔ لوگ یہ سمجھے کہ اُردو کا یہ ادیب کیا ٹھکانا عربی ادب کا بھی امام ہے۔ میری معلومات کے مطابق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب میں اس فتنے کی نشاندہی فرمائی۔ اُن کے بعد اور علماء کرام کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد ذکریا صاحب نے ایک کتاب "فتنۂ مودودیت" کے نام سے شائع کی ہے۔

اب اس مودودی کے بارے میں سکوت جرمِ عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت کیا اس پر بھی افسوس ہوا۔ اور اس دَور کا سب سے بڑا فتنہ مودودی ہے۔ (محمد یوسف بنوری)

غنیمت ہے کہ ان حضرات نے چالیس سال کے بعد ہی سہی، اس فتنہ کا احساس تو کر لیا۔ ورنہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یہ طلوعِ اسلام کو اس لئے ہدفِ دشنام طرازی بناتے رہے کہ یہ مودودی صاحب کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ـــــ یہ اس فتنہ کے سدِباب کے لئے کیا کرتے ہیں۔

۶۔ دیدہ ام مردے دریں قحط الرّجال

شیخ عبدالحق صاحب (ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ) کی ذاتِ گرامی سے قارئین طلوعِ اسلام متعارف ہیں۔ وہ ان شریف النفس انسانوں میں سے ہیں جن کا وجود اب آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ قوم کی انتہائی سیاہ بختی کی دلیل ہے۔ پچھلے دنوں ان کا ایک گرامی نامہ، پرویز صاحب کے نام موصول ہوا، جسے، ان کی تصویب سے زینت دہ اوراقِ طلوعِ اسلام کیا جا رہا ہے۔

"محترمی پرویز صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

۱۔ یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہی ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کی ابتدا سے ہی میں قلبی اور ذہنی طور پر اس کا موید اور رسالہ طلوعِ اسلام کا خریدار رہا ہوں۔ اِسی وجہ سے آپ کی بعض دوسری تحریکوں میں بھی حتی المقدور حصہ لیتا رہا ہوں۔ گو ہفتہ وار یا سالانہ اجتماعات میں شرکت کم ہی کر سکا ہوں۔ اس کوتاہی کی ایک وجہ کسی حد تک یہ بھی تھی کہ دین (اور دراصل دین و دنیا مسلمان کے لئے ایک ہی چیز ہے) کے معاملات میں میرے خیالات آپ کے خیالات سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ آپ کی تقریروں اور تحریروں پر عموماً شاعر کا مقولہ صادر آتا ہے۔ یعنی ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس ہم آہنگی کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل تو میری پیدائش ایسے خاندان میں ہوئی جس کے بزرگ صحیح اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند تھے۔ غالباً ان میں سے میرے چچا شیخ چراغ دین صاحب مرحوم و مغفور اور میرے پھوپھی زاد بھائی خانبہادر برکت علی صاحب مرحوم و مغفور کو آپ جانتے بھی تھے۔ میری تربیت میرے چچا صاحب کی زیرنگرانی ہوئی۔ پھر کالج کے زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی روزمرّہ کی مجالس میں بیٹھنے کے کافی مواقع ملتے رہے اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا۔ وہ بھی نہایت شفقت سے ہر معاملہ کو سمجھاتے تھے اور میرے ذاتی رجحانات کی بنا پر انہوں نے ایک مرتبہ یہ تجویز کیا کہ میں ملازمت سے مستعفی ہو کر جامع ازہر میں چند سال تعلیم حاصل کروں اور پھر علامہ صاحب اور میں مل کر اسلامی فقہ پر ایک مکمل کتاب مرتب کریں۔ مگر افسوس کہ اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ غالباً اس بات کا بھی آپ کو علم ہے۔

۲۔ باوجود اس قدر خیالات میں ہم آہنگی کے مجھے دو اُمور میں آپ سے اختلاف تھا۔ گو میں نے کبھی اس امر کا ذکر آپ سے یا دوسرے دوستوں سے نہیں کیا۔ ایک اختلافی نقطہ طلوع اسلام کے ہر پرچہ میں مولانا مودودی صاحب کے بیانات پر شدت سے نقطہ چینی سے متعلق تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ قومی مفاد کے پیش نظر ایسے اختلافی معاملات کو اتنی زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں۔ آجکل چونکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تعطیلات کی وجہ سے بند ہیں اور مجھے پیشہ وارانہ مصروفیت کم ہے۔ اس لئے میں نے جون۔ جولائی اور اگست ۱۹۷۶ء کے طلوع اسلام کے پرچوں کا مطالعہ بالتفصیل کیا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ نے جو رویہ اس معاملہ میں اختیار کیا ہوا ہے وہ بالکل درست اور مناسب ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہے تاکہ قوم کسی غلط فہمی کی وجہ سے کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھے۔ چونکہ میں نے گذشتہ چند سالوں میں آپ کے اس جذبہ کی نسبت جو آپ کی ان تحریرات کا محرک ہے، غلط رائے قائم کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ میں اس غلطی کا اعتراف کروں۔ یعنی اس معاملہ میں سجدہ سہو کروں۔

۳۔ میں اب آپ سے بالکل متفق ہوں کہ مولانا موصوف خود یا ان کی جماعت کے دوسرے احباب جو توضیحات مولانا کے سابقہ رویہ کی نسبت پاکستان کے بارے میں کر رہے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں، بلکہ گمراہ کن ہیں اور ان کی تردید ہر بہی خواہِ قوم و ملک کے لئے لازمی ہے۔ مولانا اور ان کے رفقاء خاصے پڑھے لکھے مسلمان ہیں۔ اس لئے انہیں اپنی غلطی کے اعتراف میں تامّل نہ ہونا چاہیئے۔ انگریزی زبان کا مشہور مقولہ ہے۔

TO ERR HUMAN, BUT TO ADMIT ONE'S MISTAKE IS ANGELIC

(غلطی کرنا بشری کمزوری ہے لیکن اپنی غلطی کا اعتراف کرنا شیوۂ ملکوتی ہے۔ (طلوع اسلام)

جو اسلامی تعلیم اور روایات کی عین عکاسی کرتا ہے۔ کاش اس پر ہمارے لیڈران خود عمل کریں اور دوسروں

کو بھی اس کی تلقین کریں۔
۴۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

راقم عبدالحق

طلوعِ اسلام

غلطی کا اعتراف و اعلان درحقیقت شیوۂ ملکوتی ہے جس کے لئے بڑی وسعتِ قلب اور اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے ہم محترم شیخ صاحب کی خدمت میں، ان کے اس اعتراف و اعلان پر دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اے کاش! اس ہمت اور حوصلہ کا دائرہ ذرا وسیع ہو جائے ورنہ ہمارے ہاں کے اچھے اچھے خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ کمرے کے اندر پرویز صاحب کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہو گئے اور باہر نکل کر ان کی مخالفت میں پیش پیش۔ قوم کو اسی منافقت نے تباہ کر دیا ہے۔

تحریفِ قرآنی کی ناپاک جسارت

پچھلے دنوں ہمیں کراچی سے کچھ مطبوعہ لٹریچر موصول ہوا جس میں وہیں سے شائع ہونے والے مجلہ — عکس چمن — کے محرم نمبر کے ٹائیٹل کی فوٹوسٹیٹ کاپی بھی شامل تھی۔ اس ٹائیٹل پر عربی زبان کے کچھ الفاظ مع ترجمہ چھپے ہوئے تھے اور ان کے نیچے لکھا تھا (سورۃ القصص - ۲۸) وہ الفاظ، سورۃ القصص کی آیت ۴۱ ایک طرف، قرآن کریم میں کہیں بھی نہیں۔ لہٰذا اس مجلہ کی طرف سے تحریفِ قرآنی کی یہ بہت بڑی ناپاک اور بیباکانہ جسارت تھی۔ ہم نے اس کا بڑی سختی سے نوٹس لیا اور اربابِ حکومت سے کہا کہ وہ اس مجلہ کے خلاف قانونی کارروائی کریں۔ کاپی ابھی پریس میں نہیں گئی تھی کہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومتِ سندھ نے رسالہ مذکور کی زیرِ تنقید نمبر کی تمام کاپیاں ضبط کر لی ہیں۔ اس کی مزید اشاعت پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اس کے پرنٹنگ پریس کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا ہے اور اس کے ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر کے خلاف ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت مقدمہ درج کر کے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔ (بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء)

ہم حکومتِ سندھ کی اس فرض شناسی کی قدر کرتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں دو ایک امور وضاحت طلب ہیں۔

۱۔ پرچہ کے ٹائیٹل پر "محرم نمبر" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پرچہ دسمبر ۱۹۷۵ء یا جنوری ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ حکومتِ سندھ کا متعلقہ شعبہ اتنے عرصے تک خاموش کیوں بیٹھا رہا اور اب یہ کارروائی اس وقت کی گئی جب اس کے خلاف پبلک کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس شعبۂ حکومت کے ذمہ دار افراد کے خلاف بھی (اس قدر تغافل اور تاخیر کی بنا پر) مناسب کارروائی ہونی چاہیئے۔ اور

۲۔ اس پرچہ کے ٹائیٹل پر لکھا ہے کہ یہ مجلہ تنظیم عکسِ چمن (پاکستان) ناظم آباد شاخ کا ترجمان ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تنظیم کس قسم کی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ ممکن ہے مقدمہ کے سلسلہ میں اس کے ایڈیٹر کا بیان اس امر پر کچھ روشنی ڈالے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور میں ہر اتوار ۸ ½ بجے صبح (فون نمبر ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**لائلپور** ہر جمعہ ۸ ½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) ۶۵ کوتوالی روڈ (فون ۲۴۹۴۲) حیات سرجری کلینک
ملتان ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز ۔ بیرون پاک گیٹ (فون ۷۱ ۲۰۷۲)	**کراچی** ہر اتوار ۹ ½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۔ دارالقائد ۲۰ ۔ ۱/بی ناظم آباد ۳ (فون ۶۱۰۴۶۸)
گجرات ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۔ ۱۶۲ لیاقت روڈ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared,
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves.

بزمِ مذاکرہ

(طلوعِ اسلام کنونیشن۔ منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

(بزمِ مذاکرہ کے مقالات سابقہ اشاعتوں میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ یہ دو مقالے مذاکرہ میں پڑھے نہیں گئے تھے کیونکہ دیر میں موصول ہوئے تھے۔ بایں ہمہ انہیں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔)

پرویز اختر اقبال

صدرِ گرامی قدر و معزز سامعین!

اقبالؔ علیہ الرحمتہ نے ہمارے اسلاف کے کردارِ حسنہ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اور ہمارے اعمال کو آئینہ دکھاتے ہوئے یوں گویا ہوئے تھے کہ ؎

اقبالؔ بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

دونوں صورتوں کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

ہمارے اسلاف نے اللہ تعالیٰ کی رسی کو یقینِ محکم کے ساتھ تھاما، عملِ پیہم کو اپنایا چار دانگ عالم میں محبت کے موتی بکھیرے۔ دُنیوی نکتۂ نگاہ سے وہ ناتواں تھے۔ مادی لحاظ سے بے سرو سامان تھے۔ عرب کے ریگستانوں میں بھیڑ بکریاں چرانے والے، تمام تہذیب علومِ جدیدہ سے بے بہرہ تھے۔ اندازِ جہانبانی سے ناواقف تھے۔ نظم و ضبط سے ناآشنا کہ انہیں اس کی کبھی تربیت ہی نہیں دی گئی تھی۔ مگر جب اس امی لقبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان خاک نشینوں کو یقین، عمل اور محبت کی شمشیروں سے آراستہ کیا۔ تو یہی خاک نشین تخت نشین بن گئے۔ وہ جو سبزہ زار کے ایک ٹکڑے کے لئے صدیوں جھگڑا کرتے تھے اب قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ان کے قدموں کے نیچے تھیں۔ اور وہ اُن سے بے نیاز، نہ تقسیم مال پر تنازعہ نہ زر اندوزی کے لئے جھگڑا۔ اور نہ حصولِ اقتدار کے لئے کشمکش! اس لئے انہیں شمشیر و سناں کا سہارا لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ آج جو صالحین کے سرخیل

اس الزام پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ وہ یا تو اس دور کی تاریخ سے بے بہرہ ہیں یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر سیرتِ صحابہ کرامؓ کو مسخ کر کے نئی پود کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کے دور پر نظر ڈالئے۔ آپ کو عالمِ عرب کے باہر بڑی بڑی سلطنتیں اپنے عوام کو استبداد کی چکی میں پیستی ہوئی ملیں گی۔ حضرتِ انسان کی خرید و فروخت کے لئے منڈیاں ایسے لگتی تھیں جیسے ہمارے ہاں میلہ مویشیاں منعقد ہوتا ہے۔ اسلام نے نہ صرف ان محکوم و بے بس انسانوں کو اس ظلم و ستم سے نجات دلائی، بلکہ اپنے تسلّط میں لانے کے بعد انہیں آزاد چھوڑ دیا کہ اسلام میں داخلے کی شرط جبر و اکراہ نہیں، رضا و رغبت ہے۔ چنانچہ جب اُن لوگوں نے دیکھا کہ ہمیں اسلام سے باہر رہ کر اتنی مراعات حاصل ہیں تو ہم کیوں نہ اس میں شامل ہو کر اُس کے ثمرات سے پوری طرح استفادہ کریں۔ چنانچہ اسی خواہش کے پیشِ نظر وہ اسلام میں فوج در فوج داخل ہوئے آج ان تلوار کے زور پر اسلام پھیلانے والوں کو ؎

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!

ہم انہی اسلاف کے نام لیوا ہیں جنہوں نے دنیا کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیا تھا مگر آج ہم اپنی راہنمائی کے لئے کبھی سرخ سویرے کی طرف دیکھتے ہیں تو کبھی سیاہ شام کی طرف!...... افسوس کہ ہماری نگاہ اُس سبز گنبد کی طرف نہیں اُٹھتی جس کی کرنوں سے چاردانگِ عالم روشن ہوا تھا۔

مسجد جو ہمارے اسلاف کو عملِ پیہم کی گاڑی پر سوار کرنے کیلئے پلیٹ فارم کا درجہ رکھتی تھی آج بے عملی کا درس دیتی ہے۔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف رکھئے جو کچھ کہوں گا حقائق کی روشنی میں کہوں گا، آج مسجد مسلمانوں میں یقینِ محکم پیدا کرنے، عملِ پیہم کا درس دینے اور محبت پر مائل کرنے کی بجائے فرقہ بندی کا منبع ہوتی ہے۔ آپ کو مولوی صاحب کے وعظ میں ننگ محو رنگ شعبدوں کی کرامات سے لے کر بلھے شاہ کی کافیوں تک ہر چیز ملے گی لیکن ان میں اگر نہیں ہو گا تو قرآن نہیں ہو گا۔ کبھی سوچتا ہوں کہ اگر اسی محراب و منبر کے وارث کو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وعظ کہنے کے لئے بلایا جاتا، جب نہ گانے کے لئے ایسے شعر تھے اور نہ سنانے کے لئے من گھڑت کہانیاں تو یہ بیچارہ وعظ کیسے کہتا۔ آج اس کا سارا زورِ بیان اور ذکر و فکر گیارھویں شریف کے گرد گھومتا ہے۔ وہ بہانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ میں وعظ کہتا ہوں آپ سننے کے لئے آجائیں۔ اختتام پر مل بیٹھ کر مٹھائی کھائیں اور اس طرح ثوابِ دارین کمائیں۔ عمل کی ضرورت نہ کہنے والے کو ہے، اور نہ سننے والوں کو۔ اس کے نتیجے میں جب اقوامِ عالم میں ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں تو اپنی بے عملی کا اعتراف کرنے کی بجائے اپنی قسمت کو کوستے، اور خدا کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ ہاں اتنا کہہ کر دل کو تسلّی دے لیتے ہیں کہ یہ ہمارے کسی گناہ کی سزا ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارا سب سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ اقبالؒ کے الفاظ میں گفتار کے غازی بنے مگر کردار کے غازی نہ بن سکے۔ یاد رکھیئے! اگر آپ اپنی شوکت و سطوتِ رفتہ اور جنتِ گم گشتہ کو دوبارہ پانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم شرطِ اوّل ہے کہ ؎

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

سعد حسن بشیر

زندگی کی کٹھن راہوں پہ چلنا بڑے عزم و استقلال کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس لئے انسان کو اپنی تمام تر قوتوں سے کام لے کر رکاوٹوں کو ٹھکراتے ہوئے، مشکلات پر قابو پاتے ہوئے آگے چلنا پڑتا ہے۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ زندگی میں انسان کے سامنے راہ نہیں، راہیں آتی ہیں۔ انسان چونکہ اپنی عقل ہی کو واحد اور معتمد ترین رہنما سمجھتا ہے اس لئے اسی کی رہنمائی میں کوئی فیصلہ کر کے چل پڑتا ہے۔ لیکن اس انتخابِ راہ کے بعد جو سفر شروع ہوتا ہے، اس میں ایک فطری سوال اُبھرتا ہے کہ آیا جس راہ پر وہ چلا جا رہا ہے وہ آخر کہاں جا رہی ہے۔ لیکن عقل تو کلّی رہنمائی دے نہیں سکتی اس لئے اس بات کا حتمی علم نہیں ہوتا۔ اس طرح انسان چلتا تو ضرور ہے، کہ زندہ رہنے کے لئے حرکت ضروری ہے، مگر اس کا قلب وساوس و شکوک کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ اسے خود اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ صحیح ہے اور جس مقصد کے لئے کر رہا ہوں وہی صحیح ہے ---------- اس یقین کے فقدان سے کیا ہوتا ہے ـــــ وہ اپنی قوا نائیوں کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا۔ کیونکہ ہر موقعہ پہ یہی شبہ دامنگیر رہتا ہے کہ عین ممکن ہے یہ کام غلط ہو اور میری توانائیاں ضائع ہو جائیں۔ اس طرح وہ مکمل طور پہ عمل نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ نامکمل اعمال ضائع ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ نتیجہ تو اس عمل کا نکلتا ہے جسے تکمیل تک پہنچایا جائے۔ اور عملِ پیہم اور عمل کامل کے لئے یقینِ محکم کی ضرورت ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے:۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ (۵/۵)

جس نے ایمان سے انکار کیا اس کے اعمال ضائع ہو

اس کے برعکس:۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲/۲۵۶)

جس نے غیر خدا کی قوتوں سے انکار کیا اور خدا پہ ایمان لے آیا اس نے ایسی مضبوط رسی پکڑ لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔

گویا جو شخص خدا پہ ایمان لے آتا ہے۔ یعنی اس بات پہ ایمان لے آتا ہے کہ خدا انسانوں کی راہنمائی بذریعہ وحی کرتا ہے۔ اس کو ایسی روشنی مل جاتی ہے جس کی مدد سے وہ باآسانی صحیح راستہ تلاش کر لیتا ہے اور یہ سہارا اتنا محکم ہوتا ہے کہ اس کے ٹوٹنے یا کمزور ہونے کا امکان ہی نہیں۔ جب تک انسان اسے پکڑے رہے گا۔ یقیناً اس کے سہارے آگے بڑھتا جائے گا۔

لیکن اس کو پکڑنے سے پہلے اس بات پر یقین لانا ضروری ہے کہ وحی کی راہنمائی ہی وہ واحد

ذریعہ ہے جو صحیح منزل تک لے جائے گی۔ یہ یقین، دلائل و براہین سے پیدا ہوتا ہے اور علم و بصیرت کی بنا سے مستحکم ہوتا ہے۔ اس سے انسان کے قلب و ذہن میں یہ یقین علیٰ وجہ البصیرت راسخ ہو جاتا ہے کہ وحی کی راہ ہی تمام نوعِ انسانی کے لئے فلاح کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنا ہر عمل اس وحی کو عملی نظام میں منتقل کرنے کی کوشش کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اس میں پوری پوری توانائیاں استعمال کرتا ہے۔

عمل کرنے کے لئے اور اس کے بارآور ہونے کے لئے اس بات پر یقین ضروری ہے کہ یہ ایسی راہ ہے جس سے روگردانی تباہی ہے، کیونکہ اس کے سوا ہر راہ گمراہی ہے۔ چنانچہ اس بات پر یقین کہ اس پیغام کو اگر جلد از جلد عام کرکے اسے عملی نظام کی صورت میں تشکیل نہ دیا گیا تو نوعِ انسانی خلفشار و انتشار کے سیلاب میں بہہ جائے گی، عمل کو تیز تر کر دیتا ہے، اور عملِ پیہم کی کامیابی کے لئے تمام تر توانائیاں اسی مقصد کے لئے مرتکز کر دی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن نے بتا دیا ہے کہ خدا نوعِ انسانی کے ایمان لانے کا محتاج نہیں۔ اگر وہ وحی کے پیغام کو سمجھ کر اس پر ایمان نہیں لاتی تو خود اپنی بقا کی صلاحیت کھو بیٹھے گی اور خدا کا قانون اسے مٹا کر رکھ دے گا۔ اور اس کی جگہ کسی ایسی نوع کو آئے گا جو قوانینِ خداوندی سے زیادہ ہم آہنگ ہو گی۔

جب انسان کو وحی کی صداقتوں پر یقین نہ ہو تو وہ مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ اسے زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ اور مایوس قوم یا شخص کوئی جدوجہد کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ ان میں عمل کی قوت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وحی پر یقینِ محکم رکھنے والا مشکل سے مشکل حالات میں بھی پُرامید رہتا ہے۔ اسے علیٰ وجہ البصیرت اس بات کا علم ہوتا ہے کہ قانونِ خداوندی ہی برحق ہے اور وہ بالآخر فتح یاب ہوگا۔ اور وقتی طور پر باطل کتنا ہی پُرشکوہ و پُرہیبت کیوں نہ ہو، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہیں۔ اور حق کی مسلسل ضربیں اس کا بھیجہ نکال کر رکھ دیں گی۔

زندگی کی کٹھن راہوں میں انسان کے سامنے موانع آتے ہیں۔ بڑی بڑی رکاوٹیں اس کا راستہ روکتی ہیں۔ یہی نہیں، غلط راستے مزیّن و آراستہ کرکے سامنے لائے جاتے ہیں۔ اگر انسان کو قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر یقین نہ ہو، اس بات پر یقین نہ ہو کہ ان رکاوٹوں کو قرآن کی شمشیر سے توڑا جا سکتا ہے، تو ان زبردست مخالف قوتوں کو دیکھ کر خود اسے اپنی ذات کی ممکنات پر اعتماد نہیں رہتا۔ وہ اس "گمان" میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میری کوئی حیثیت ہی نہیں اور میں ان طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ زندگی میں ہی موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے ؎

جانے کہ داوند دیگر نہ گیرند آدم بمیرد از بے یقینی

انسان تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور تذبذب منافقت کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ منافقین

کے بارے میں ہے کہ: مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ (۴/۱۴۳) اور منافق دوُرخی پالیسی کی حامل قومیں اپنا کشخص برقرار نہیں رکھ سکتیں اور دوسروں کی غلام بن جاتی ہیں کیونکہ برق رفتار زمانے میں زندہ رہنے کے لئے قوموں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہونا ضروری ہے۔

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں

اور غلامی کی حالت میں نہ تو عمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کے بارآور ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ غلامی میں اپنی مرضی سے اور اپنے اصولوں کی روشنی میں عمل کرنے ہی نہیں دیا جاتا۔

قرآن کہتا ہے کہ اُس میں هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۷/۲۰۳) ان لوگوں کے لئے راہنمائی اور سامانِ نشو و نما موجود ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ گویا قرآن سے راہنمائی انہی کو ملتی ہے جو علیٰ وجہ البصیرت اس کی سچائی پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ یعنی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ عمل کے جو نتائج اس نے بیان کئے ہیں وہ اگرچہ متشکل نہیں ہوئے لیکن ہوں گے ضرور۔ یعنی انہیں اس کی صداقت پر اس قدر پختہ یقین آ جاتا ہے کہ وہ ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھ کر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عمل کا نتیجہ نکلے گا ضرور ـــــ جلد یا بدیر ـــــ وہ ہر چیز سے بے پرواہ عمل کئے جاتے ہیں۔ اور جب خدا کے کائناتی رفتار سے بڑھنے والے آفاقی قانون کو انسانی عمل کا خارجی سہارا مل جائے تو وہ اور تیز رفتاری سے بلند ہو جاتا ہے۔

اس عملِ پیہم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو وحی کی صداقتوں پر یقین ہو ـــ اس بات پر یقین ہو کہ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اس میں کامل سکون و اطمینان دینے والی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ یہ یکسر علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر قائم ہے۔ اسی لئے اس کو سمجھ کر راہنمائی بنانے والے کے دل میں یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اسی کی راہنمائی صحیح ہے۔ اس طرح منتشر توانائیاں مرتکز ہو جاتی ہیں۔ اور انسان سمجھ لیتا ہے اس کا ایک ایک سانس قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیزی پر یقین رکھتا ہے اور اسی کی بدولت وہ بارآور ہو بھی جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ خدا ہی کا وعدہ ہے کہ نتیجہ سامنے ضرور آتا ہے، چاہے ابھی آ جائے یا موت کے بعد۔

اسی لئے بہارِ زندگانی میں کامیابی کی اوّلین شرط یقینِ محکم ہے۔ کیونکہ اسی پر اگلی منزلوں کی بنیادیں استوار ہیں، اور اس کے بغیر ان تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔

(سعد حسن بشیر۔ کراچی)

پروفیسر وفیع اللہ شہاب

مرغ کی قربانی

کے بارے میں اہلِ حدیث کا فتوےٰ

طالب علمی کے زمانہ میں راقم نے جماعت اہلِ حدیث کے کسی رسالے یا اخبار میں یہ فتویٰ دیکھا تھا کہ ان کے نزدیک مرغ کی قربانی جائز ہے۔ یہ پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں میرا ذوقِ تحقیق اتنا پختہ نہیں تھا کہ اس فتویٰ کو محفوظ کر لیتا۔ گذشتہ چند سالوں میں کئی دفعہ مجھے اس فتویٰ کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے یہ کہیں سے نہ مل سکا۔

ہمارے علاقے کے دینی مدرسے کے لئے جو صاحب قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے آتے ہیں ان کا تعلق اہلِ حدیث مسلک سے ہے۔ اس سال عیدالاضحےٰ کے موقع پر جب وہ کھال لینے ہمارے گھر تشریف لائے تو میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ انہیں اس فتویٰ کا علم ہے یا نہیں ان سے کہا کہ ہم نے تو اس سال مرغ کی قربانی دی ہے۔ اس پر انہوں نے نہایت خشمگیں آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس پر میں نے بعض صحابۂ کرام رضؓ کے اس عمل کی طرف اشارہ کیا کہ وہ بھی مرغ کی قربانی دیتے تھے۔ اس کے بعد ان کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے میں نے انہیں آرام سے بٹھایا۔ عید کا دن تھا ان کی کچھ خاطر تواضع بھی کی اور درخواست کی کہ اگر وہ ہمیں یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھا دیں تو ہم قربانی کی کھال کی نقد قیمت ادا کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بخوشی میری درخواست قبول کی اور فرمانے لگے کہ قربانی کا اصل ثواب تو قربانی کی کھال سے ملتا ہے۔ کیونکہ یہ نیک کاموں پہ خرچ ہوتی ہے جبکہ گوشت وغیرہ لوگ خود کھا جاتے ہیں۔ اس پر میں نے حضرت ابن عباس رضؓ کے مسلک کا حوالہ دیا کہ وہ عید کے دن کسی جانور کو ذبح کرنے کے بجائے دو درہم کا گوشت خرید کر لوگوں سے کہتے کہ: هٰذِهٖ اضحية ابن عباسؓ۔ یہ ابن عباس رضؓ کی قربانی ہے۔ (کتاب الام از امام شافعی جلد ۲ صفحہ ۱۹۱) لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ جیسے مشہور صحابی اپنے آپ کو قربانی کی کھال کے اس ثواب سے محروم کر دیں۔ میرا پہلا ہی سوال اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ اس حوالے سے وہ اور بھی بپھر گئے۔ سخت غصے کی حالت میں یہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے کہ یہ سب منکرینِ سنّت کی پھیلائی ہوئی شرارتیں ہیں!

اپنے مقصد میں یوں ناکام رہ جانے کے بعد میں نے مایوس ہونے کی بجائے کچھ دوسرے اہلِ علم اہلِ حدیث

حضرات سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بیک زبان فرمایا کہ اہلِ حدیث علماء قرآن و سنت سے اس قسم کا مذاق نہیں کر سکتے۔ تاہم میں نے اپنی تلاش جاری رکھی اور "جوئندہ یابندہ" کے مصداق مجھے ایک جگہ سے اشارہ مل گیا کہ اہلِ حدیث علماء کے تمام فتاویٰ، کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب میرا کام آسان تھا کیونکہ شائع شدہ کتاب کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں مجھے جلد ہی فتاویٰ کا مطلوبہ مجموعہ مل گیا جو فتاویٰ ستاریہ کے نام سے مکتبہ سعودیہ حدیث منزل کراچی نمبرا سے شائع ہوا تھا۔ اس فتاویٰ کی دوسری جلد کے صفحہ ۷۲ پر مرغ کی قربانی کے بارے میں اہلِ حدیث علماء کا یہ فتویٰ مل گیا جسے من و عن درج ذیل کیا جاتا ہے۔

فتویٰ بابت قربانی مرغ

سوال نمبر ۲۹۰:- معروض آنکہ زمانہ حال میں چیزوں کی گرانی حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس وجہ سے امسال قربانی کا جانور پندرہ بیس روپے سے کم ملنا دشوار ہے۔ بندہ نے سنا تھا کہ پہلے کسی صحیفہ* میں یہ مضمون نکل چکا ہے کہ مرغ کی قربانی بھی جائز ہے۔ فرمانِ نبوی اَلدِّیْنُ یُسْرٌ اور فرمانِ الٰہی مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ کے عموم کے ماتحت اگر آپ مرغ کی قربانی جائز سمجھتے ہوں تو بندہ کو تحقیق کرا دیں ادلہ سے، مثلاً اگر کسی صحیفہ گذشتہ میں یہ ثبوت ادلہ سے دیا گیا ہو تو وہ صحیفہ ارسال کر دیں۔ اگر نہ ہو تو جس جس کتاب میں اس مسئلہ (ثبوت قربانی مرغ) کی تحقیق ہو، مع نام و صفحہ تحریر فرمائیں بندہ کو مسئلہ کی تحقیق ہو جائے گی۔ اور آپ کو اجرِ عظیم ملے گا۔ مکرر عرض ہے کہ مولانا! میں ادلہ کا طالب ہوں صریحی ہوں یا اجتہادی جس کسی صحیفہ یا رسالہ میں ہوں ارسال فرمائیں۔

از مولوی محمد صاحب۔ ضلع فیروزپور

خریدار صحیفہ اہلِ حدیث۔ نمبر ۱۴۹۳۔

جواب ۲۹۰:- شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔ کوئی غریب اگر اس مسئلہ پر عمل کرے تو اس کو موردِ الزام نہ بنانا چاہیئے کیونکہ حضرت بلال رضؓ و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما جیسے صحابہؓ سے یہ امر ثابت ہے۔ مزید تفصیل و ادلہ مع نام کتاب و صفحہ وغیرہ کے لئے رسالہ صحیفہ اہلِ حدیث بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ ملاحظہ ہو جو آپ کو ارسال کیا گیا ہے۔

از مفتی ابو محمد

منقول از صحیفہ اہلِ حدیث دہلی بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق نومبر ۱۹۴۴ء جلد ۲۴ نمبر ۱۲۔

یہ فتویٰ بتیس (۳۲) سال پرانا ہے اور اپنے مفہوم میں واضح۔ اس وقت تو اس رقم میں مرغ کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں آج قیمتیں بیس گنا زیادہ بڑھ چکی ہیں اور اچھے بھلے سفید

* مراد اہلِ حدیث کا رسالہ یا اخبار ہے۔

پوشوں کے لئے گزارہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

مَیں نے یہ فتویٰ کھالیں اکٹھا کرنے والے مذکور الصدر مولوی صاحب کو دکھایا، جو اِس عمل کو منکرینِ حدیث کی شرارت قرار دیتے تھے۔ تو وہ اسے ایک دو دفعہ پڑھنے کے بعد بالکل خاموش ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان حضرات کا مبلغ علم کس قدر ہوتا ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ جس بات کا علم نہیں ہوتا اسے "منکرینِ حدیث" کی شرارت قرار دے کر کس طرح خود فریبی یا ابلہ فریبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس روش کو بدلنا تو مشکل ہے لیکن ان سے اتنی التماس ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کو مطعون کرنے سے پہلے، کم از کم اپنے مسلک کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر لیا کریں! ہر اس بات کو، جس کا جواب آپ سے نہ بن پڑے، منکرینِ حدیث کی شرارت کہہ کر جان چھڑا لینا یا مطمئن ہو کر بیٹھ جانا تو علم اور دین کی بارگاہ میں، قابلِ قبول مسلک قرار نہیں پا سکتا۔

ان حضرات سے دوسری درخواست یہ ہے کہ اس زمانے میں جبکہ بھیڑ، بکری، گائے کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں آپ اپنے مسلک کے اس فتویٰ کو زیادہ سے زیادہ عام کریں تاکہ مسلمان زیادہ تعداد میں "قربانی کا ثواب" حاصل کر سکیں! ہم دیکھیں گے کہ کیا ان حضرات کے نزدیک "قربانی کی کھالیں" زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یا صحیح فتویٰ کی اشاعت جو ان کا دینی فریضہ ہے۔

طلوعِ اسلام

قرآنِ کریم کی رُو سے "قربانی" کی صحیح پوزیشن کیا ہے، طلوعِ اسلام میں اس کے متعلق بڑی وضاحت سے، باصرار و تکرار لکھا جا چکا ہے۔ جو حضرات اس سوال سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قرآنی فیصلے، جلد اوّل" کا مطالعہ فرما لیں جس میں اس موضوع پر ایک مبسوط تحقیقاتی مقالہ درج ہے۔

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اُس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آ جاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائے گی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیج دیا جائے گا۔

ان سہولتوں کے علاوہ آئندہ کنونشن کے موقع پر، جو ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں منعقد ہو رہی ہے، ادارہ کی کتابوں پر خصوصی رعایت دی جائے گی۔ جو احباب ۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۶ء تک پیشگی خریداری کی اسکیم میں شامل ہو جائیں گے وہ دُہری رعایت کا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ اس خصوصی رعایت کا اعلان اسی شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ناظم ادارہ)